

# بے نام سی عقیدت



میں سال پہلے وہ مجھے اپنی کہانی سنا کر چلا گیا اور کبھی لوٹ کر نہیں آیا خدا جانے وہ اب کہاں ہے

طارق اسلمیل ساگر

راوی۔ رشید

میں عمر کے اس حصے میں پہنچ چکا ہوں، جہاں انسان کو واقعی خدا یاد آ جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنے وہ گناہ بھی جو کبھی اس نے بڑے غرور یا انداز میں کیے تھے۔ میری عمر ستر سال کے قریب تو ہوگی جن میں سے جوانی کے کم از کم بیس سال جیلوں کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ ایک وہ دور تھا۔ جب آپ کہتے ہوں گے یہ بوڑھا سٹھیا گیا ہے اور کسی غلط

ساگر ڈائجسٹ

باتیں کرتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے انگریز کا دور غلامی دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس وقت کے بد معاش آج کی طرح نہیں ہوتے تھے۔ جس گاؤں یا شہر میں ایک بد معاش ہوتا تھا اس گاؤں اور شہر کے لوگ رات کو لمبی تان کر سو چلایا کرتے تھے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کا جان و مال بالکل محفوظ ہے اور اس بد معاش کے ہوتے کسی کی جرات نہیں کہ ان کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھ سکے۔

میرا نام آپ کچھ بھی سمجھ لیں۔ نام میں رکھائی کیا ہے ان کا کردار ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ میں نے بڑے بڑے نام والوں کو اپنی ضرورت کے لئے معمولی معمولی سے لوگوں کے سامنے ٹھکنے دیکھا ہے اور بڑے گناہ سے لوگوں میں مجھے ایسا کچھ نظر آیا ہے کہ وہ مجھے دنیا کے عظیم ترین انسان لگے۔ میں نے ایک عام سے زمیندار گھرانے میں جنم لیا۔ ہمارا گاؤں ادھر سرحد کے پار پنجاب کا ایک مشہور گاؤں تھا۔ اسے آپ چھوٹا سا قصبہ ہی سمجھ لیں۔ بعض دیہات آج بھی آپ کو ایسے ملیں گے جن کی ناموری کی وجہ قتل و غارت گری یا چوری چکاری ہوتی ہے۔ بزرگ جانتے ہیں کہ کئی دیہات انہی چوروں اور ڈاکوؤں کے نام پر آباد ہو گئے تھے۔

میرے والد ایک مذہبی اور سیدھے سادے انسان تھے۔ گاؤں کے واقعات سے الگ تھلک وہ بڑے اطمینان سے اپنی زندگی گزار رہے تھے جبکہ ہمارے گاؤں کے ہر دوسرے گھر میں کوئی نہ کوئی جرائم پیشہ شخص رہتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں سکھوں کے گھر مسلمانوں سے کچھ زیادہ ہی تھے۔ یہ کوئی معمولی گھناہٹم کے سکھ نہیں تھے بلکہ ”ذیلدار“ سکھ تھے۔ سرکار دربار میں بھی ان لوگوں کو عزت تھی اور دولت کی بھی ان کے ہاں ریل پیل رہتی تھی۔ ان سکھوں کے مقابل جو مسلمان زمیندار تھے وہ بھی کسی طرح ان سے کم نہیں تھے۔ یہ لوگ بھی سرکار دربار میں ایک مقام رکھتے تھے اور حکومت کی چوچہ گیری میں سکھوں سے آگے نکلنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

میرے والد ایک مذہبی اور سیدھے سادے انسان تھے۔ گاؤں کے واقعات سے الگ تھلک وہ بڑے اطمینان سے اپنی زندگی گزار رہے تھے جبکہ ہمارے گاؤں کے ہر دوسرے گھر میں کوئی نہ کوئی جرائم پیشہ شخص رہتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں سکھوں کے گھر مسلمانوں سے کچھ زیادہ ہی تھے۔ یہ کوئی معمولی گھناہٹم کے سکھ نہیں تھے بلکہ ”ذیلدار“ سکھ تھے۔ سرکار دربار میں بھی ان لوگوں کو عزت تھی اور دولت کی بھی ان کے ہاں ریل پیل رہتی تھی۔ ان سکھوں کے مقابل جو مسلمان زمیندار تھے وہ بھی کسی طرح ان سے کم نہیں تھے۔ یہ لوگ بھی سرکار دربار میں ایک مقام رکھتے تھے اور حکومت کی چوچہ گیری میں سکھوں سے آگے نکلنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

میرے والد ایک مذہبی اور سیدھے سادے انسان تھے۔ گاؤں کے واقعات سے الگ تھلک وہ بڑے اطمینان سے اپنی زندگی گزار رہے تھے جبکہ ہمارے گاؤں کے ہر دوسرے گھر میں کوئی نہ کوئی جرائم پیشہ شخص رہتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں سکھوں کے گھر مسلمانوں سے کچھ زیادہ ہی تھے۔ یہ کوئی معمولی گھناہٹم کے سکھ نہیں تھے بلکہ ”ذیلدار“ سکھ تھے۔ سرکار دربار میں بھی ان لوگوں کو عزت تھی اور دولت کی بھی ان کے ہاں ریل پیل رہتی تھی۔ ان سکھوں کے مقابل جو مسلمان زمیندار تھے وہ بھی کسی طرح ان سے کم نہیں تھے۔ یہ لوگ بھی سرکار دربار میں ایک مقام رکھتے تھے اور حکومت کی چوچہ گیری میں سکھوں سے آگے نکلنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

میرے والد ایک مذہبی اور سیدھے سادے انسان تھے۔ گاؤں کے واقعات سے الگ تھلک وہ بڑے اطمینان سے اپنی زندگی گزار رہے تھے جبکہ ہمارے گاؤں کے ہر دوسرے گھر میں کوئی نہ کوئی جرائم پیشہ شخص رہتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں سکھوں کے گھر مسلمانوں سے کچھ زیادہ ہی تھے۔ یہ کوئی معمولی گھناہٹم کے سکھ نہیں تھے بلکہ ”ذیلدار“ سکھ تھے۔ سرکار دربار میں بھی ان لوگوں کو عزت تھی اور دولت کی بھی ان کے ہاں ریل پیل رہتی تھی۔ ان سکھوں کے مقابل جو مسلمان زمیندار تھے وہ بھی کسی طرح ان سے کم نہیں تھے۔ یہ لوگ بھی سرکار دربار میں ایک مقام رکھتے تھے اور حکومت کی چوچہ گیری میں سکھوں سے آگے نکلنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔

ساگر ڈائجسٹ



اوقات زیادتیاں کر جاتی ہے لیکن عدالتیں تو اپنی ہیں۔ کہیں نہ کہیں انصاف تو مل ہی جاتا ہے۔ اگر بڑے کے دور میں انصاف صرف ان کے لئے تھا جو اس کی حکومت کے لئے کتے کی طرح وفادار رہتے تھے۔ ورنہ تو کوئی غریب اور انگریز دشمن نوجوانوں کی جوانیاں جیلوں کی بیعت چڑھ گئیں۔ میرا چچا اس علاقے میں "جنا بد معاش" کے نام سے مشہور تھا۔ والد کے بالکل برعکس وہ اس علاقے کا ماما ہوا "تھامو" تھا۔

تھامو اس بد معاش کو کہا کرتے تھے جس کے پاس چھوٹے چھوٹے بد معاش چوری چکاری کے جانور برائے فروخت یا چھپانے کے لئے لایا کرتے تھے۔ یہ چچا والد سے عمر میں بہت چھوٹا تھا۔ میرے والد نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ میں چچا کے سامنے سے بھی بچا رہوں لیکن ایک تو چچا نے شادی نہیں کی تھی دوسرے اس وجہ سے کہ میں اپنے والد کا پیلوٹھی کا بیٹا تھا اور دنیا میں میرے والد اور چچا تھے ہی دو بھائی۔ ہماری کوئی چھوٹی بھی نہیں تھی۔ میرے چچا کو مجھ سے بہت زیادہ محبت تھی۔ میں نے بمشکل آٹھ جماعتیں پڑھیں۔ وہ بھی والد کی سختی اور مسلسل عمرانی کی وجہ سے گھر پر وہ خود مجھے قرآن پاک پڑھاتے تھے اور اس بات کا خیال رکھتے کہ میں زیادہ وقت انہی کے ساتھ گزاروں۔ لیکن مجھے جب کبھی موقع ملتا اپنے چچا کے پاس بہادروں اور بد معاشوں کی کہانیاں سننے بیٹھ جاتا۔

چچا کی محبت رنگ لائی اور ایک روز میں بھی اس کے ساتھ واردات پڑ گیا۔ پہلی رات جب میں چچا کے ساتھ چوری کی واردات پر گیا تو میری عمر بمشکل سولہ سال تھی۔ ہم لوگ شام ڈھلے اپنے گاؤں سے روانہ ہوئے۔ چچا نے اس سے پہلے مجھے اس فن کے اسرار و رموز سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے مجھے یہی سکھایا تھا کہ وہ تو مرد ہی نہیں جس نے پانچ دس چوریاں نہ کی ہوں۔ اس سے پہلے چچا مجھے مزے لے لے کر اپنے گھر سے میں آنے اور پھر ان لوگوں کو چمکے دے کر لٹل جانے کی باتیں سنایا کرتا تھا۔ جب کبھی وہ کسی بڑے نامی

گرمی چور یا بد معاش کا ذکر کرتا تو بالکل اس طرح جیسے کسی اعلیٰ ہستی کا بیان کر رہا ہوں۔ تمام راستے وہ مجھے ایسے ہی واقعات سناتا آیا۔ ہم نے پیدل ہی قریباً بیس میل راستہ دوڑھائی گئے میں طے کر لیا۔ آپ کو یہ بات بتا دوں کہ اس زمانے میں یہ کوئی اتنا زیادہ فاصلہ نہیں تھا اور لوگ عموماً پیدل چلا کرتے تھے۔ ہم لوگ جس جگہ پہنچ کر رہے وہاں دور ایک گاؤں کے دھندلے دھندلے نقش دکھائی دیئے۔ اندھیرے میں اتنی دور تک ٹھیک سے نظر تو نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اکا دکا جملے والے دیئے یا لائین کی لوہی احساس دلارہی تھی کہ یہ کوئی گاؤں ہے۔ مجھے بعد میں علم ہوا کہ یہ سکھوں کا ایک مشہور گاؤں ہے۔ اس گاؤں کے سردار ارد گرد کے علاقے میں ہمارے گاؤں کے سرداروں کی طرح ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ حال ہی میں ان لوگوں نے ایک قیمتی گھوڑی خریدی تھی جس کی اطلاع میرے چچا کو اس کے خبروں نے پہنچا دی تھی۔ میرا چچا معمولی قسم کا وارداتی تو تھا نہیں۔ وہ عموماً بڑے ہاتھ مارا کرتا تھا۔ اور ایسا قیمتی شکار تو اس نے کبھی چھوڑا ہی نہیں تھا۔ ہم دونوں گاؤں کے باہر کاد کے کھیتوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ چچا مجھے یہاں بھی بڑے بڑے بد معاشوں کی وارداتیں سناتا رہا۔ بڑے چور اور بد معاش ایسی وارداتیں بچوں کے ساتھ نہیں کیا کرتے۔ فی وہ جلدی کسی پر اعتماد کرتے ہیں لیکن میرے چچا کی جہانم دیدہ نظروں نے یا تو مجھ میں چھپے "دلیر آدمی" کو دیکھ لیا تھا وہ پہلی ہی واردات میں میری جھجک ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس کی باتیں اتنی دلچسپ ہوتی تھیں کہ ایک مرتبہ سننے بیٹھ جاؤ تو اٹھنے کوئی نہیں چاہتا تھا۔

اس نے وقت گزری کے لئے مجھے اپنے ایک "ڈاکے" کی کہانی سنائی شروع کر دی اور بتاتا رہا کہ کس طرح وہ اپنے ساتھیوں سمیت گاؤں والوں کے گھر سے میں آکر لٹل گیا تھا۔ ان باتوں میں ہمارے دوڑھائی گئے شائع ہو گئے۔ لیکن کیا مجال جو مجھے وقت کا ذرا سا بھی احساس ہوا ہو۔ کہانی کے اختتام پر چچا نے کہا۔ "بچہ ٹھٹھا ہو جا۔" ہم روانہ ہونے

والے ہیں۔"

میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس دور میں ہمارے علاقے میں امام دین گوبادامنگی ادا ہے ڈاکو کی کہانیاں لوگ گا گا کر سنایا کرتے تھے۔ چکی بات تو یہ ہے کہ اس لمحے میں خود کو کسی ایسی ہی کہانی کا کردار محسوس کر رہا تھا۔

پچانے بھی اس حویلی کا نقشہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ جہاں سے ہم نے گھوڑی کھوئی تھی اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ کدو علاقے کے مانے ہوئے زمیندار ہیں۔ گھوڑی کی حفاظت کے لئے انہوں نے حویلی میں پہرے دار بھی بٹھایا رکھے ہوں گے۔

اس زمانے میں آفتیں اسلحہ اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی اسے بڑی سمجھا جاتا تھا کہ کسی کو چھپ کر گولی مار دی جائے۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ڈانگ کو جس کے ایک سرے پر لوہے کی نیخیں گاڑی گئی تھیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر تولا۔ چچا نے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر مجھے جھکی دی اور ہم دونوں اللہ کا نام لے کر کھیتوں سے باہر نکل آئے۔

سردیوں کا آغاز تھا اور درات کے اس پہر ہلا علاقہ ہونے کی وجہ سے اچھی خاصی سردی پڑنے لگی تھی۔ مجھے اپنا سارا وجود تپتا ہوا محسوس ہو رہا تھا یوں جیسے اچانک بخار چڑھ آیا ہو۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ ہم چلتے گئے۔ چچا آگے آگے تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے۔ ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گیا۔ ہم گاؤں کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ اکا دکا روشنیاں جو دور سے جھلملاتی نظر آ رہی تھیں اب دم توڑ چکی تھیں۔ گاؤں کے دوسرے کونے سے چوکیدار کی آواز "جاگتے رہو" کبھی کبھی ضرور سنائی دے دیتی تھی لیکن چچا کو جیسے اس آواز کی پرواہ ہی نہیں تھی۔

اس نے ایک لمحے کے لئے رک کر میری طرف دیکھا۔ شاید میری حالت کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میں چچا سے آنکھیں ملاتے ہی مسکرا دیا اور چچا خوش ہو گیا۔ ہم دونوں اس سلسلے میں خاص احتیاط برت رہے تھے کہ ہمارے پاؤں کی چاپ بالکل سنائی نہ دے۔

اس نے ایک لمحے کے لئے رک کر میری طرف دیکھا۔ شاید میری حالت کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ میں چچا سے آنکھیں ملاتے ہی مسکرا دیا اور چچا خوش ہو گیا۔ ہم دونوں اس سلسلے میں خاص احتیاط برت رہے تھے کہ ہمارے پاؤں کی چاپ بالکل سنائی نہ دے۔

اچانک میں فٹھک کر رک گیا۔ چوکیدار کی آواز کہیں قریب ہی سے سنائی دے رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ہمارے بالکل نزدیک آ گیا ہو۔ چچا نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں تیزی سے اس کے نزدیک آ گیا اور سر گوشی کرنے کے انداز میں کہا۔

"چوکیدار قریب آ گیا ہے۔"

"گھبراؤ نہیں۔ چلے چلو۔" چچا نے مجھے تسلی دی اور میرا بازو پکڑ کر آگے بڑھا دیا۔ میں گھبرایا تو واقعی نہیں تھا۔ لیکن کچھ پریشان ضرور ہو گیا کہ اس طرح چوکیدار کے نزدیک آنے کے باوجود آخر چھپا کر کیوں نہیں جاتا۔ جلد ہی میری گھبراہٹ دور ہو گئی جب میں نے چوکیدار کو ایک ہاتھ میں لائین اور دوسرے میں ڈھڈھ پکڑے اپنے نزدیک آتے دیکھا۔

اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا اور اس طرح بے جھجک ہماری طرف آ رہا تھا جیسے ہم چور نہیں۔ اس کے کوئی قریبی رشتہ دار ہیں۔ میں نے ڈانگ کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر تولا اور پاؤں آگے پیچھے کر کے جم کر کھڑا ہو گیا۔ بالکل اس طرح جیسے کسی پر حملہ کرنے والا ہوں۔ چچا نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔

اب تو میں واقعی پکڑا کر رہ گیا۔ چوکیدار نے ہمارے قریب آ کر لائین سمیت اپنا ہاتھ ماتھے تک لے جا کر میرے چچا کو سلام کیا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے گاؤں کی ایک دیران سی سمت کو چلنے لگا۔ اس دوران وہ "جاگتے رہو" بھی کہتا جا رہا تھا۔ ہم دونوں دبے پاؤں اس کے تعاقب میں چل رہے تھے میں سمجھ چکا تھا کہ یہ چوکیدار میرے چچا کا "اپنا آدمی" ہے۔

ہم دونوں اس کے تعاقب میں گاؤں کے ایک قدرے دیران گوشے میں جا کر رک گئے۔

"سناء چونی لال۔ کیا حالات ہیں؟" چچا نے اس کی طرف دیکھا۔

"سرکار سب اچھا ہے۔ سب ٹھیک۔"

اس نے بڑی دھیمی آواز میں چچا کو بتانا شروع کیا کہ



مکوڑی کہاں بندھی ہے اور اس کے گرد کتنے محافظ ہیں۔ میں بظاہر دونوں کی گفتگو سے لائق کھڑا رہا۔ لیکن میرے کان اسی طرف لگے ہوئے تھے چونی لال دھلتی عمر کا ایک گندی رنگ اور دہرے بدن کا لیکن خاصا چالاک بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔

اس کا انداز گفتگو بتا رہا تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی قسم کا ”چوکیدار“ ہے۔ مجھے علم نہیں وہ میرے چچا کا وقف کیسے بنا۔ لیکن یہ بات مجھے اچھی طرح سمجھ آ رہی تھی کہ وہ چچا سے اپنا حصہ پہلے ہی مانگ رہا تھا۔

”چونی لال۔“ چچا کی قدرے غصیلی آواز سنائی دی۔

”تم مجھے آج سے نہیں پچھلے دس سال سے جانتے ہو۔“

”مم۔۔۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا مہاراج جی!“ چونی لال گھٹکھٹایا۔

تھوڑی دیر تک وہ آپس میں کھسپھسپھ کرتے رہے۔ پھر چونی لال ہاتھ باندھتے ہوئے چلا گیا۔ وہ ہماری مخالف سمت ”جاگتے رہو“ کا شور مچاتا جا رہا تھا اور مجھے اس گاؤں والوں کی بے بسی پر ہنسی آ رہی تھی کہ جن کی بربادی کا سامان ان کا اپنا محافظ کر رہا تھا۔

چونی لال کی روانگی کے چند منٹ بعد ہی چچا نے مجھے ”آپجی“ کہہ کر آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

میں اپنے چچا کے ساتھ ہی اس حویلی کے دروازے کے پاس پہنچ گیا جہاں ہم نے واردات کرنی تھی۔ حویلی کے کچین گہری نیند سو رہے تھے۔ دیہاتوں کی حویلیوں میں شاید ہی کوئی دروازے پر دھڑکائی لگاتا ہو۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں اندر داخل ہوئے۔ چونی لال نے جو میرے چچا کا بھڑکاپہلے ہی سے یہاں کے سارے حالات بتا دیے تھے۔ ایک بڑے کمرے کے سامنے جس کا دروازہ بند تھا چچا نے مجھے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ میں اپنی ڈیوٹی سمجھ گیا تھا۔ مجھے اس کمرے سے اچانک اٹھ کر باہر آنے والوں سے نمٹنا تھا اور چچا نے مکوڑی کھوٹی تھی۔

ہوئے میں نے گردن موڑ کر دیکھا دو مسکے لٹھیاں اٹھائے برآمدے میں کھڑے تھے۔ ان میں سے کسی زوردار آواز سنائی دی۔

”مکوڑی نکل گئی۔“

اس کے ساتھ ہی ہم بھی نکل گئے۔ لیکن میں تصوری آنکھ سے دیکھ سکتا تھا کہ ہمارے پیچھے وہاں کیا طوفان بدتمیزی برپا ہوگا۔

مکوڑی سر پٹ بھاگ رہی تھی۔ میں مکوڑی کی نگلی پیٹھ پر اپنے چچا کی کمر تھامے بیٹھا تھا۔ میرا چچا تو ہوا ”سوار“ تھا۔ لیکن اس طرح میرے لئے سواری ممکن نہیں تھی۔ ہم نے گاؤں سے نکلنے کے لئے غلط راستہ افراتفری میں میں منتخب کر لیا۔ چچا کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔ کیونکہ ہمارے پیچھے شور بلند ہو رہا تھا اور اب سارا گاؤں کسی بھی لمحے بیدار ہو سکتا تھا۔

”بچو! تو گھبرانا نہیں۔ ابھی ”وار“ میرے پیچھے آئی گی۔ یہ ابھی کم عمری مکوڑی ہے۔ شاید دو سو اوروں کے ساتھ ”وار“ سے نہ نکل سکے۔ میں تجھے چونی لال کے پرد کر کے جا رہا ہوں۔ کل رات وہ تجھے یہاں سے نکال کر میرے پاس پہنچا دے گا۔“ چچا نے گردن موڑ کر مجھے کہا اور میرے رد عمل سے آگاہ ہوئے بغیر ہی مکوڑی کو ایک دوسرے راستے پر موڑ دیا۔

میں کیا جواب دیتا۔ گاؤں میں شور برپا ہو رہا تھا۔ یہ تو میں بھی سمجھتا تھا کہ چند منٹ کے بعد ہی سکھوں کے ملازم اپنے مکوڑوں۔ مکوڑیوں پر ہمارے تعاقب میں آئیں گے۔ کیونکہ ان کے لئے یہ امر بڑی زبردست تسک کا باعث ہوگا کہ کوئی سرداروں کی مکوڑی کھول کر لے گیا۔

میرا چچا کو گلیاں کھیلے ہوئے نہیں تھا وہ بڑا گھما چور تھا اور ہر کام پلاننگ سے کرتا تھا۔ اسے علم تھا کہ کہاں چوری کرنے جا رہا ہے۔ کسی بھی ناگہانی آفت کا مقابلہ کرنے کے لئے اس نے تمام ہنگامی بندوبست کر رکھے تھے۔ گاؤں کی ایک گلی کا موڑ کاٹتے ہوئے اس نے پورے زور سے مکوڑی کی لکڑی کھینچیں اور مکوڑی اچانک پچھلے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔

میں اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ الٹ کر نیچے جا کر۔ چچا نے مکوڑی کو سنبھال کر سیدھا کھڑا کیا۔ میرے ذہن پر گرتے ہی جو شخص مجھے اٹھانے کے لئے لپکا وہ چونی لال تھا۔!!

یہ شیطان شاید منصوبے کے مطابق یہیں ہمارا منتظر تھا۔ چچا نے اسے بمشکل ایک دو فترے میرے متعلق کہے اور صورت حال سمجھا دی۔

”بے فکر ہو چو بدری۔ میرے جیسے جی کوئی بچے کی طرف میلی نظر سے بھی نہیں دیکھ سکے گا۔“ چونی لال نے چچا کی تسلی کرادی۔

”رب رکھا بچہ۔“ چچا کے منہ سے نکلا اور اس نے مکوڑی بھگادی۔

مجھے گرتے وقت تو کچھ زیادہ احساس نہیں ہوا لیکن اٹھ کر کھڑا ہوا تو یوں لگا جیسے میری ٹانگ اور بازو نوٹ پکے ہوں۔ اچانک ہی درو کی ٹیس اٹھی تھی۔ چونی لال کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ایک طرف کھینچنے لگا۔ میرے لئے اس بات کا تصور ہی بڑا ہولناک تھا کہ میرا کوئی بازو یا ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ جان بچانے کا خوف اور پھر تازہ تازہ چوٹ اس وقت تو مجھے احساس نہ ہوا۔ لیکن جیسے ہی گاؤں کے ایک کونے میں الگ سے بنے مکان میں داخل کر کے چونی لال نے کٹڑی لگائی تو اچانک درو کی ٹیسیں میرے بدن سے اٹھنے لگیں۔

یہ مکان جس میں ہم داخل ہوئے تھے ایک کمرے ایک رسوئی اور چھوٹی سے برآمدے پر مشتمل تھا۔ چونی لال نے مجھے برآمدے میں ایک چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ”کون؟“ کی آواز آئی۔

”میں ہوں بیٹی جلدی کر!“ چونی لال نے بڑی دھیمی لیکن قدرے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور چاند کی روشنی میں میری نظر جس شکل پر پڑی اس نے مجھے مبہوت کر کے رکھ دیا۔ یہ مہندر تھی چونی لال کی بیٹی۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی مجھے



اپنی دادی کی کہانی یاد آگئی جو اس نے بچپن میں مجھے کئی دفعہ سنائی تھی۔ یہ کہانی کچھ اس طرح تھی کہ ایک جادوگر نے خوبصورت لڑکی کا روپ دھار کر دیوان راستے پر کھڑی ہو جایا کرتی تھی اس کے حسن کو جو کوئی نظر بھر کے دیکھتا پھر کا ہو کر رہ جاتا۔

مجھے یوں لگا جیسے مہندر وہ جادوگر ہے اور میں اپنی مسافر۔

چاند کی شفاف اور چمکیلی روشنی میں اس کی بڑی بڑی سیاہ رنگت کی آنکھیں جو اس کے سارے چہرے پر چمکی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ مجھے اپنے کچھ میں وحشت محسوس ہوئی۔

”مہندو! یہ لڑکا چوہدری ہے۔ خیال رکھنا اس کا۔“ اس نے اپنی بیٹی سے مختصر بات کی۔

گھبراہٹ تو مہندر کے نزدیک بھی شاید نہیں بچتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا جیسے میری اچانک آمد یہاں معمول کی کوئی کارروائی تھی۔

”فکر نہ کرنا چاہا۔ تو نکل جا۔“ اس نے واپس مڑتے ہوئے اپنے باپ سے کہا۔

”چنگا چوہدری جی۔ گاؤں جاگ رہا ہے۔ میں ذرا ادھر کی فکر کروں۔ آپ بے فکر ہو جائیں یہاں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔“

اس دوران گاؤں میں ”چوڑ۔“ ”چوڑ۔“ کا شور بلند ہونے لگا تھا۔ چوٹی لال تیری سے باہر کی سمت لپکا۔ مہندر اتنی ہی پھرتی سے اس کے پیچھے دوڑی۔ اس نے باہر دروازے کی کھڑکی پر جا دی۔ مجھے اب گاؤں کے لوگوں کی مختلف آوازوں کے ساتھ چوٹی لال کی زوردار آواز بھی سنائی دینے لگی تھی۔

”وہ ادھر۔ ادھر نکل گیا ہے۔ ابھی اس طرف گیا ہے۔“ وہ زور زور سے چلا کر کسی کو بتا رہا تھا۔ شاید اچانک ہی کوئی اس سے ٹکرا گیا تھا۔

میں اس دوران ہونٹوں کی طرح مہندر کے سراپے کا جائزہ لیتا رہا جو اب میری طرف واپس آ رہی تھی۔ مجھے اپنی

سائیس رکھی محسوس ہو رہی تھی۔ مہندر مجھ پر سحر بن کر طاری ہو گئی تھی۔ میرے نزدیک آکر وہ ٹھہر گئی۔ بالکل ایسے جیسے اچانک کائنات کی گردش ختم جایا کرتی ہے۔

”چوہدری جی اندر آ جاؤ۔“ اس نے میری طرف جھک کر سر گھولی۔ اس طرح اچانک جھٹکنے سے اس کے جسمانی خطوط کچھ ایسی بے باکی سے واضح ہوئے کہ میں سم کر رہ گیا۔ میرا دل یکدم بڑے زور سے دھڑکا اور یوں لگا جیسے سینے کا بھجرتوڑ کر من پچھلی پھڑک کر باہر آن کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ گاؤں کی وہ گلی مختلف کھڑوں کی گاؤں کی آواز سے لرزنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وار میرے چچا کے تعاقب میں اس کے پیچھے نکلے ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چاہا کہ اٹھ جاؤں۔ اپنی جگہ سے ذرا سا ہلایا تھا کہ اچانک میرے منہ سے ”ہائے“ نکل گئی۔ مہندر جو دروازے کی طرف مڑ رہی تھی۔ میری اچانک ”ہائے“ پر میری طرف گھوم گئی۔

”کیا ہوا چوہدری جی۔ کیا ہوا۔۔۔۔۔“ اسی نے گھبرائی ہوئی آواز میں مجھ سے پوچھا۔ مجھے کچھ شرمی محسوس ہوئی کہ ایک مرد ہوتے ہوئے اس لڑکی کے سامنے بزدلی کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔

”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔۔۔۔۔“ میں نے درد سے بے حال ہونے کے باوجود کھینا سا ہو کر کہا اور اپنے زور سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس طرح اچانک کھڑے ہونے سے مجھے تکلیف تو بے حد ہوئی لیکن اس بات کی خوشی ضرور تھی کہ میری ہڈیاں سلامت تھیں۔ اگر خدا خواستہ کوئی ہڈی ٹوٹی ہوتی تو میں یوں اٹھ کر کھڑا نہ ہو سکتا۔

”چلو۔“ میرے منہ سے نکلا۔

لیکن۔۔۔ مہندر بدستور میرے چہرے پر نظریں جمائے وہیں جم کر کھڑی رہی۔ شاید اس نے درو کی اذیت برداشت کرتے ہوئے چہرے کی قدرتی طور سے بدلتی ہوئی رنگت کو

دیکھ کر میری اندرونی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ بغیر کچھ کہے وہ میرے نزدیک آگئی۔ قد میں وہ قریباً میرے برابر ہی تھی۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ اس طرح شاید مجھے سہارا دے کر اندر تک لے جانا چاہتی تھی۔

اس کے اچانک قرب کے احساس نے میرے وجود کو پگھلا کر رکھ دیا۔ میں سحر زدہ سا قریباً لنگھتا ہوا اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے جسم سے خارج ہونے والی برقی روبا مجھے اپنی شریانوں میں دوڑتی محسوس ہونے لگی تھی۔ میرے وجود میں انگارے تڑپ رہے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی بھرپور عورت کو اتنے اچانک اور اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ یہ تجربہ میرے لئے بڑا ہی جان لیوا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے مجھے اسی بستر پر سہارا دے کر بٹھا دیا جہاں شاید تھوڑی دیر پہلے وہ لیٹی ہوئی تھی سمیت خاصی اونچی تھی۔ دیواروں میں بنے روشندانوں اور کھلے دروازے میں سے چاند کی روشنی چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔

اندھیرے میں جلد ہی میری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ اس کمرے کی اندرونی دیوار میں مجھے ایک چھوٹا سا دروازہ لگا دکھائی دے رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس میں سے ایک اور کمرے کا راستہ بھی جاتا تھا۔ مہندر نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

دیوار میں بنے ایک طاقے میں دھری لائین کو اس نے نزدیک رکھی دیا سلائی سے روشن کیا اور لائین کب لواتی گھٹا دی کہ اندر ماحول تو دکھائی دے لیکن باہر سے لاکھ کوشش کرنے پر بھی اندر کچھ نظر نہ آ سکے۔

مجھے جسم کا درد بے حال کیے دے رہا تھا۔ لائین جلا کر مہندر میری طرف آئی اور بڑی بے تکلفی سے میری نزدیک بیٹھ گئی۔ میں اس کی دیدہ دلیری پر حیران ہی تو رہ گیا۔

”کہاں چوٹ لگی ہے۔“ اس نے بڑی ہمدردی سے دریافت کیا۔

”کہیں نہیں۔ خیر ہے۔ خیر ہے۔“ میرے منہ سے نکلا۔

## دریائے رحمت

مریض کی عیادت کے وقت اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت کا نزول ہوتا ہے کیونکہ مریض دل و جان سے شفا کے لئے اللہ کے حضور رحم کی التجا کر رہا ہوتا ہے اس لئے مریض پر اللہ مہربان ہو کر اپنی رحمت نازل فرماتا ہے لہذا جو شخص مریض کی عیادت کے لئے جتنا وقت اس کے پاس گزارتا ہے تو گویا وہ دریائے رحمت میں بیٹھا ہے۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص مریض کی عیادت کرتا ہے تو وہ دریائے رحمت میں غوطے لگاتا ہے اور جس وقت وہ مریض کے پاس بیٹھتا ہے تو وہ دریائے رحمت میں غوطے لگاتا ہے۔

(انتخاب موت کا حزمہ) (سلطان محمد علی - ملتان)

”چوہدری کیا لڑکیوں کی طرح باتیں کر رہے ہو، اس میں شرمانے والی کیا بات ہے“ اتنا کہہ کر اس نے میرے بازو کو بڑے آرام سے دونوں ہاتھوں میں قلم کر کے بلند کیا۔ پھر اسے آہستہ آہستہ نیچے اور کبھی اوپر کر کے شاید اس امر کا جائزہ لینے لگی کہ ہڈی تو کہیں ٹوٹ نہیں گئی۔ مجھے اس طرح بازو کو حرکت دینے سے تکلیف تو بہت ہوئی لیکن ضبط کیے رہا۔

مہندر نے اس کے بعد یہی عمل میری ٹانگ سے دہرایا۔ پھر اس نے خودی فیصلہ بھی دے دیا۔

”ہڈی پر ضرب لگی ہے اور شاید ماس بھی کہیں سے پھٹ گیا ہے۔ کوئی بات نہیں ابھی آرام آ جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ اپنے پیچھے اس نے دروازے سے بھی بند کر دیا تھا۔ میری حالت اس سحر زدہ معمول کی ہی تھی جو اسے عامل کے اشاروں کا محتاج ہو کر رہ گیا ہو۔ میں یہ بات بالکل بھول چکا تھا کہ گاؤں والے مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ بس ایک مہندر تھی جو



میری تمام حسیات پر چھا گئی تھی۔ اس کی واپسی بمشکل چار پانچ منٹ بعد ہی ہوئی۔

مہندر نے ایک ہاتھ میں دودھ کا گلاس پکڑ رکھا تھا جس میں وہ ہلدی پھٹکری اور گھی وغیرہ ملا کر لائی تھی۔ ان دنوں دیہاتوں میں یہی بہترین طریقہ علاج ہوا کرتا تھا۔

”لے لی لے چوہدری۔“ اس نے گلاس مجھے تھما دیا۔ اس کی مسیحا نے میرے زخم بڑی حد تک مندر کر دیے تھے۔ چکی بات تو یہ ہے کہ اس ”فسخ“ سے زیادہ اس احساس نے کہ مہندر میرے لئے دودھ لے کر آئی ہے۔ مجھے تندرست کر دیا تھا دودھ مجھے تھا کہ باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو ایک لیپ سا اس نے منی کے کنارے میں بنا کر رکھا ہوا تھا۔

اس نے میرے ”ننہ“ کرنے کے باوجود میرے بازو اور ٹانگ پر اس لیپ کی ہاش کر دی۔ چند منٹ بعد ہی میرا درد اس طرح کا فور ہو گیا۔ جیسا کبھی چوٹ لگی ہی نہیں تھی۔ مہندر بڑی کامیاب ”مسجا“ تھی۔

یہ میری اور اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے ہاش کے خاتمے پر مجھے لیٹ جانے کو کہا اور ایک رضائی مجھ پر ڈال دی۔

”چوہدری! اپنے جسم کو ہوانہ لگنے دینا۔“ اس نے مجھے کہا اور خود باہر چلی گئی۔ شاید وہ ہاتھ دھوئے گئی تھی۔

واپس آ کر اس نے دوبارہ اندر سے کنڑی لگائی اور اپنی چار پائی پر بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا اب تک اس کا سلوک میرے ساتھ بالکل ایسا تھا جیسے میں اس کا کوئی قریب رشتہ دار ہوں۔ لیکن اس مرتبہ جب وہ اندر آئی تو اس کے چہرے کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔

”چوہدری اب آرام سے سو جا، بے فکر ہو کر، یہاں کوئی تیری گرد کو بھی نہیں چھو سکتا۔“ اس نے مجھے کہا اور خود بھی اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

آپ لوگ ذرا سوچیں میں نو جوان لڑکا تھا اور وہ چڑھتی جوانی کا شاہکار۔ یہاں بالکل تنہائی تھی اور چونی لال کی

حیثیت میرے نزدیک ایک پالتو جانچوہ دار کتے سے زیادہ کیا ہو سکتی تھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ صبح ہونے سے پہلے وہ یہاں نہیں آ سکتا اور آج تو اس کا صبح کے وقت آنا بھی مشکل تھا، کیونکہ صبح ہوتے ہی اس گاؤں کا کھوئی گھوڑی کا کھرا اٹھالیتا اور چوکیدار کو اس کے ساتھ کھرے کے تعاقب میں جاتا تھا۔ میرے والد نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ میں اپنے چچا کے شر سے بچا رہوں۔ لیکن چچا نے مجھے اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ میں کوئی بڑا پار سا آدمی نہیں تھا ایک معمولی سا انسان تھا جو کسی بھی لمحے ٹھوکر کھا سکتا تھا۔

میرے جسم نے اس کے ہاتھوں کا لمس جذب کر لیا تھا۔ میرے بدن میں انگارے تڑپ رہے تھے۔ مجھے اپنے جسم میں ابو کے بجائے آگ دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ مہندر کو مخاطب ہی کر سکوں۔ ابھی میرے بدن میں اتنی قوت تھی کہ میں اپنے شیطانی ارادے کو پایہ تکمیل پہنچا سکوں۔ لیکن ایک عجیب سا نقش ایک بے نامی عقیدت تھی کہ جس نے مجھے اس کی سمت بڑھنے سے روکے رکھا۔ ابھی تک مہندر نے لائین بجھائی نہیں تھی۔ لیکن بغیر مطلب یا ضرورت کے اس نے ایک بات بھی مجھے نہیں کہی تھی۔ میں ڈیڑھ دو گھنٹے تک کروٹیں بدلتا اور خود سے لڑتا رہا۔ خدا جانے مہندر کو میری اندرونی کشش کا احساس ہو گیا یا پھر وہ بھی شاید اسی ایلے سے گزر رہی تھی جس کا میں شکار ہو چکا تھا۔ مجھے اس کے خلاف کی حرکت محسوس ہوئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کیا بات ہے چوہدری خیند نہیں آ رہی کیا؟“ اس نے بڑی بے باکی سے کہا، لیکن میں محسوس کر سکتا تھا کہ خاصی ہمت صرف کرنے کے بعد ہی میری سست یہ فقرہ اچھا لایا ہے۔

تب میری زبان میں بالکل کلت نہ آئی اور بے اختیار منہ سے نکل گیا۔ ”ہاں! مہندر تم نے میری خیند بھگا دی ہے۔ میں اپنی چوٹ کی تکلیف محسوس نہیں کر رہا لیکن.....“ اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔

مہندر اچانک ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دوسری طرف یہی قدم

کسی غیر اختیاری فعل کا محتاج ہو کر میں نے اٹھایا تھا۔ اس نے اپنے پاؤں چار پائی سے نیچے لٹکا دیئے اور میری طرف، ٹھٹھکی ہاتھ کر گھورنے لگی۔ اس کی آنکھیں مجھے ہیروں کی طرح جگمگ کرتی اور اپنے اندر جھنکی محسوس ہو رہی تھیں۔

”چوہدری جی!“ چند لمحوں کی اذیت ناک سکوت کے بعد اس نے مجھے مخاطب کیا۔

”نم غریب لوگ ہیں۔ آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔“

خدا جانے مجھے کیا ہوا یوں جیسے کسی نے اچانک ہی مجھے چار پائی سے اٹھا کر کھڑا کر دیا ہو۔ میں پہنا نازم زدہ سا چلتا ہوا اس کے نزدیک پہنچا اور اس کا بازو تھام لیا۔ مہندر نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

”مہندر!“ کوئی میرے اندر سے بولنے لگا۔ ”تم کیا ہو۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں تمہارے ہی لئے اس گاؤں میں آیا تھا۔“

مہندر کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کے لئے بدلا۔ پھر وہ نارمل ہو گئی۔ اس نے آہستگی سے میرا ہاتھ الگ کر دیا اور بولی۔ ”چوہدری! اگر مرد ہوتا تو پھر اس ہاتھ پکڑنے کی لاج رکھتا۔ آج تک کسی کی جرات نہیں ہوئی کہ میرا ہاتھ پکڑے معلوم نہیں میں نے تمہیں ایسا کیوں کرنے دیا ہے۔ لیکن اب ایسا ہو ہی گیا ہے تو اس کی شرم رکھنا۔ جاؤ اب لیٹ جاؤ۔ اس طرح اچانک گرم سرد ہونا تمہارے لئے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔“

میرا جواب سنے بغیر وہ اپنی چار پائی پر میری طرف پیٹھ کر کے لیٹ گئی۔ اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اچانک گھٹن سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں سانس لے رہا ہوں۔ میرے اندر جس طوفان نے پھیل چا کر کھی تھی وہ پر سکون ہو کر ٹھہر گیا۔

میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کی جرات ہی نہیں کی اور چپ چاپ لیٹ گیا۔ لینے کے بمشکل پانچ دس منٹ بعد مجھے خیند آگئی اور صبح تک لمبی تان کر سوتا رہا۔

گاؤں میں مجھے صبح نماز کے وقت والد صاحب اٹھا دیا کرتے تھے۔ یہ میری عادت بن چکی تھی کہ میں رات کو کتنی ہی دیر سے سوؤں صبح فجر کے وقت جاگ اٹھتا تھا لیکن اس روز جب مجھے مہندر نے بنگا یا تو روشندان سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔

میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

اس نے مجھے تسلی دی کہ ایسی کوئی گھبرانے والی بات نہیں۔ میں نے اٹھ کر پہلے سے گرم کیے ہوئے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ بازو میں درد کا احساس ابھی باقی تھا۔ البتہ میری ٹانگ اب بالکل درست ہو چکی تھی۔ میں نے دن کی روشنی میں جب مہندر کا چہرہ دیکھا تو ایک مرتبہ پھر مجھ پر وہی رات والی کیفیت طاری ہونے لگی۔

مہندر نے میرے لئے دودھ گرم کیا اور انڈوں کے ساتھ زبردست میرے مطلق میں اتار دیا۔ خدا جانے یہ اس کی ادائے بے نیازی تھی یا وہ میری آتش شوق کو مزید بھڑکانا چاہتی تھی کہ اس نے صبح بالکل یوں ظاہر کیا جسے رات کوئی بات ہوئی ہی نہیں تھی۔ وہ کچھ بولتی یا نہ بولتی میری یہ خواہش ضرور تھی کہ مہندر میری آنکھوں کے سامنے موجود رہے۔ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا وہ شام کے بعد بہر حال مجھے یہاں سے چلے جانا ہے۔ صبح ناشتے پر تھوڑی دیر کیلئے چونی لال آیا اور ہمیں صرف یہ اطلاع دے کر چلا گیا کہ کھوئی نے کھرا اٹھالیا ہے اور میں اس کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اس نے اپنی بیٹی کو میرے متعلق دوبارہ تاکید کر دی تھی۔

ایک بات تو ظاہر تھی کہ کسی چور کو چھپانے کا مہندر کے لئے یہ پہلا تجربہ ہرگز نہیں تھا۔ لیکن یہ بات میرے لئے ضرور حیران کن تھی کہ چونی لال اس پر اتنا اعتماد کیوں کرتا ہے۔ ایک مرحلہ پھر ایسا آیا کہ مجھے اپنی اس الجھن کا جواب بھی مل گیا۔

چونی لال گیا تو میں نے مہندر سے کہا۔ ”مہندر! میں رات کو یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے بھول نہ جانا۔“

”چوہدری!“ اس نے بڑے مضبوط لہجے میں مخاطب کیا۔



مہندر نے آج تک کسی کو وچن نہیں دیا، برتا جانے میرے دل پر تو نے کیسا جادو کر دیا ہے کہ میں..... وہ خاموش ہو گئی۔  
 ”آج اتوار ہے۔۔۔ میں بدھ کی رات کو پہلے پہر تمہارا انتظار کروں گا۔“ میں نے اسے گاؤں کے باہر ایک پرانے مندر کے متعلق بتاتے ہوئے کہا۔  
 ”میں آ جاؤں گی چوہدری۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا، میں چونی لال کی بیٹی ضرور ہوں لیکن چوری کا مال نہیں کر جس کا جی چاہے مجھے اٹھا کر لے جائے۔“ اس کے لہجے کی مضبوطی اس کے کردار کی عظمت کی غماز تھی۔ میں حیران رہ گیا کہ ایسی باتیں مہندر کو کس نے سکھائی ہیں۔  
 دو پہر تک ہم دونوں نے جی بھر کے باتیں کیں۔ اس کی رات والی باتوں میں پائی جانے والی چٹکی ختم ہو چکی تھی اور اب وہ میرے لئے ایک معصوم لڑکی بن چکی تھی۔ اس نے احتیاطاً مجھے کمرے کے اندر موجود دوسرے کمرے میں چھپائے رکھا۔ یوں تو وہاں کسی کے آنے کا خطرہ نہیں تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی عورت مہندر کو ملنے آ جاتی۔  
 دو پہر تک چونی لال واپس آ گیا۔  
 ”بڑا چالاک کھوتی ہے چوہدری جی!“ اس نے مجھے آتے ہی باخبر کیا۔ ”اس نے کھیتوں کے پتھوں بچ اٹھا کر اسے کچی سڑک تک پہنچا دیا ہے۔ چوہدری جی نے اسے اچھا خاصا پکڑ دیا تھا۔ تمام کھیتوں میں کھرا بکیر اٹھا اس میں گھوڑی کا، پھر واری گھوڑیوں کے کمرے بھی تھے۔ لیکن وہ تو بڑا استاد آدی ہے۔ بڑے سردار کے آدی اسے رات ہی لینے چلے گئے تھے۔ یہاں سے دس میل دور گاؤں ہے اس کا اور صبح ہونے سے پہلے لے آئے۔“ پھر وہ خود ہی ہنس پڑا۔  
 ”لیکن کیا یاد کرے گا وہ بھی میرا نام بھی چونی لال ہے۔ میں نے چوہدری جی نے گاؤں کی طرف ان لوگوں کا دھیان ہی نہیں دیا۔“  
 کہنے کو تو چونی لال نے یہ کہہ دیا تھا یہ الگ بات کہ جب شام ڈھلے دو بجے ہمارے گاؤں کی حدو کے باہر چھوڑنے گیا تو وہاں فیلداروں کے ڈیرے پر چٹانیت موجود تھی۔ میں اس

طرف جانے کے بجائے پکڑ کاٹ کر گھر چلا گیا۔  
 گھر پہنچا تو والد بڑے بے چینی لیکن غصے سے میرے منتظر تھے۔  
 مجھے دیکھتے ہی ان کا پارہ مزید چڑھ گیا اور انہوں نے بغیر کچھ کہے سنے ایک ڈنڈا اٹھا کر مجھے پینٹا شروع کر دیا۔ اگر ماں اس روز ہمارے درمیان نہ آ جاتی تو ممکن ہے آج میں آپ کو یہ کہانی سنانے کے لئے زندہ ہی نہ بچتا۔ میرے والد کو چچانے تو ہرگز یہ نہیں بتایا ہو گا کہ وہ مجھے واردات پر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میرے والد نے میرے رات باہر گزارنے سے یہ انداز لگایا تھا۔  
 والد کی مار نے ایک مرتبہ پھر میرا سوا بیا درد جگا دیا۔ یہاں کوئی مہندر میرے لئے دودھ کا پیالہ اور ماش کی دوا تو لے کر کھڑی نہیں تھی۔ ماں کو یہ علم نہیں تھا کہ میں پہلے ہی زخمی ہوں۔ اس نے یہی سوچا ہو گا کہ باپ کی ظالمانہ مار نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔ ماں نے مجھے تسلی دی اور سمجھایا کہ چچا کی صحبت سے دور رہوں۔ لیکن وہ بپاریہ یہ جان سکی کہ اب معاملہ بہت آگے نکل چکا ہے۔ میں نا اہلگی میں اتنی دور نکل گیا تھا کہ جہاں سے اب واپس لوٹ آتا میرے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔

دو پہر کے بعد جب والد کھیتوں پر جا چکے تھے تو چچا میری خبر گیری کے لئے آ گیا۔ میرے لئے اس کے دل میں جو بے پناہ محبت تھی وہ اس کی آنکھوں اور چہرے میں سمٹ آئی تھی۔ اسے علم ہو چکا تھا کہ مجھے چوٹ لگ گئی ہے، دودھ صاف کھئے وہ میرے قریب بیٹھا میری تیمارداری کرتا رہا۔

چچا کی زبانی مجھے علم ہوا کہ اس گاؤں کے کھوتی نے کھرا کچی سڑک تک پہنچا دیا تھا حالانکہ اس نے گھوڑی کو سارے گاؤں میں اس طرح گھمایا اور بھگایا تھا کہ اس کے تعاقب میں آنے والوں کے ساتھ ہی اس کی گھوڑی کا کھرا بھی گم ہو جائے۔ لیکن کھوتی بڑا ہوشیار ہے۔ یہ تو خدا کا شکر ہوا کہ چونی لال نے کوئی لالچ نہیں دیا اور نہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چونی لال ہی کو پھنسا دیتا۔

بہر حال قصہ مختصر اس کچی سڑک کے بعد ان لوگوں کا خیال صرف ہمارے ہی گاؤں تک جاسکتا تھا۔ اب انہوں نے یہاں پچائیت بھیجی تھی۔

اس دور میں جیسا کہ میں نے پہلے بتایا پولیس بھی براہ راست کسی ملزم کی ماں بہن کو تنگ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ سکھ بھی ہمارے علاقے کے فیلداروں کے پاس آئے تھے۔ انہیں امید تھی کہ سکھ ہونے کے ناطے ہمارے گاؤں کے سکھوں سے انہیں کوئی مدد مل جائے گی۔ لیکن ہمارے گاؤں کے سکھوں نے انہیں بتا دیا کہ وہ ان کے کہنے پر یقین نہیں کریں گے۔ انہوں نے اس گاؤں کے مشتبہ آدمیوں کو اپنے طور پر بلا کر ان سے درخواست کی تھی کہ وہ گھوڑی واپس موڑ دیں۔ میرے چچانے اقرار کر لیا تھا کہ گھوڑی اس نے نکالی ہے لیکن یہ کہہ دیا تھا کہ وہ ”ہائیں“ نہیں موڑے گا۔  
 وہ ان سے پیسے لے کر گھوڑی واپس موڑ دے لیکن چچا نے انہیں بتایا کہ گھوڑی اب اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ ہمارے گاؤں کے سردار یہ سمجھتے تھے کہ بچا ج بول رہا ہے۔ انہوں نے دوسرے گاؤں سے آنے والوں سے کہا کہ وہ ان کا نقصان پورا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن یہ لوگ بعید تھے کہ وہ پیسے نہیں لیں گے اور ہائیں واپس لیں گے۔ انہوں نے جب پچائیت ہی میں میرے چچا کو دھمکیاں دیں تو ہمارے گاؤں کا سردار ہونا سکھ جو سکھوں میں بڑا معزز سمجھا جاتا تھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوسرے گاؤں سے آنے والے فیلداروں کے سربراہ اشیر سکھ کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اشیر یہاں! میرے سامنے تمہاری یہ جرات کیسے ہوئی کہ تم میرے گاؤں کے کسی آدمی کو دھمکی دے رہے ہو۔ چپ چاپ واپس لوٹ جاؤ۔ اب ہم نقصان بھی پورا نہیں کریں گے اور ”ہائیں“ بھی نہیں موڑیں گے۔“

فیلدار اشیر سکھ بڑا زمانہ شناس آدمی تھا۔ اس نے ایک دنیا دیکھی تھی اور محسوس کر سکتا تھا کہ اگر اس نے اب مزید کوئی غلط بات کہہ دی تو یہ لوگ اس کی ٹھکانی بھی کریں گے۔ اس نے سردار ہونا سکھ سے کہا۔ ”ہونا یہاں! میں تو سکھ

بھائی سمجھ کر تمہارے پاس چلا آیا تھا۔ اگر تم نے بھی ان لوگوں کا ساتھ دینا ہے تو..... خیر میں دیکھ لوں گا۔“  
 اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ہمراہ آنے والے بھی اس کے ساتھ ہی واپس چلے گئے۔ بات اب گاؤں کی عزت پر آ گئی تھی۔ ہونا سکھ نے میرے چچا سے کہہ دیا کہ اب مردانگی اس میں ہے کہ وہ گھوڑی واپس نہ موڑے۔  
 ہونا سکھ چچا کو یہ بات نہ بھی کہتا تو بھی گھوڑی کبھی واپس نہ جاتی۔ اپنے چچا کو جانتا تھا آج تک اس سے کوئی مائی کا لال کسی بھی قسم کی برآمدگی نہیں کرے گا تھا۔ اب تو خیر بات ہی اور تھی۔

چچا میری تیمارداری کو آیا تھا۔ کافی دیر بعد اٹھ کر چلا گیا۔ ہم سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ میرے علاوہ تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ بہن کو بیانی ہوئی تھی اور یہاں سے دور ایک اور گاؤں میں رہ رہی تھی۔ دو بڑے بھائی والد کے ساتھ کھیتی باڑی میں ہاتھ بٹاتے تھے اور ایک مجھ سے چھوٹا تھا۔ والد صاحب کو ساری زندگی یہی دکھ رہا کہ وہ اپنی تمام اولاد کو اس ماحول سے محفوظ رکھنے کے باوجود مجھ سے بچا سکے۔  
 رات کو وہ آئے تو مجھے پھر سمجھنا شروع کر دیا۔ لیکن وہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ شیطان جب انسان پر غلبہ پالے تو پھر ایسی نصیحتیں کسی کام نہیں آیا کرتیں۔ الایہ کہ کوئی شکر ہی آدمی کو سنبھالا دے سکے۔

میں نے مہندر سے اتوار کے روز ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ بیٹے کے دن تک میری تمام توانائیاں واپس آ چکی تھیں اور میں خود کو پھر سے تازہ دم محسوس کرنے لگا تھا۔ اس دوران مجھے یہی امید تھی کہ پولیس کسی بھی لمحے آئے گی اور چچا کو گرفتار کر کے لے جائے گی۔ ایسا اکثر ہوتا رہتا تھا۔ پولیس آتی اور چچا کو لے جاتی تھی۔ اس کے ریمانڈ کے لئے۔ لیکن آج تک مال برآمد نہ ہونے کی وجہ سے میرا چچا ہمیشہ حوالاتی ہی رہا۔ اسے کبھی سزائے قید نہیں ملنی تھی۔  
 اشیر سکھ نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ جانتا کہ ارد گرد کے سو پچاس دیہاتوں میں اس کا بڑا نام ہے اور اگر



پولیس جے سے گھوڑی برآمد نہ کروا کی تو اس نام کو بھل گئے گا۔ اس نے یہ معاملہ خود ہی سننے کی ٹھان لی تھی۔

اس دوران چچا نے مجھے پھر سے اگلی واردات کے لئے تیار کر لیا تھا۔ پہلی واردات پر میرا طرز عمل اسے بڑا پسند آیا تھا اور مکمل اور بہادر چور کو بھی دکھایا تھا۔ میں نے چچا سے زمانے بھر کی باتیں کیں لیکن اشارہ بھی مہندر کا ذکر نہ کیا۔

چچا نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ گھوڑی اس نے کہا پہنچا دی ہے۔ شاید اسے یہ ڈر رہا ہوگا کہ اگر پولیس مجھے بھی پکڑ کر لے گئی یا میرا یہ مانڈ لے لیا گیا تو میں تشدد برداشت نہیں کر سکوں گا اور پولیس کو بتا دوں گا۔ یہ بات تو چھپاوت ہی میں

اشیر سنگھ نے بتا دی تھی کہ جٹا کیا نہیں تھا۔ کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا۔ لیکن ہمارے دیہاتوں میں بدعاشی کے مروجہ اصولوں کے مطابق نہ تو بتاؤ سنگھ نے دریافت کیا کہ وہ "کوئی اور" کون تھا؟ نہ ہی چچا نے بتایا۔

اتوار کا دن میں نے مہندر کو ملاقات کے لئے پوچھی نہیں کہہ دیا تھا۔ ہمارے گاؤں میں "سائیں سونا" کا عرس ہفتے کے روز شروع ہو رہا تھا اور میرے پاس اس عرس میں شمولیت کی آڑ میں یہاں سے غائب ہونے کا موقع موجود تھا۔

میں اتوار کی شام ہی کو میلے میں شمولیت کے لئے گھر سے نکل گیا۔ میلہ خاصا بھرا ہوا تھا۔ گرد گرد دیہاتوں سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ یہاں آئے ہوئے تھے۔ قہیڑ وغیرہ لگے تھے۔ میں چپ چاپ وہاں سے نکل گیا۔ میں اندازے کے مطابق وقت مقررہ سے کچھ پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ لیکن

خوشی سے میرا رواں رواں ناپنے کا جب میں نے مندر کے ایک کونے میں کھڑی مہندر کو دیکھا۔ شاید اس نے چپ کر مجھے اس طرف آتے دیکھا تھا اور پہنچانے پر سامنے آگئی تھی۔

ہم دونوں مندر کی بیڑیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ میری اور میں اس کی خیریت دریافت کرنے لگا۔ میں ابھی تک اس سے کھل کر بات کرنے کا حوصلہ نہیں پاتا تھا۔

رات قدرے اندھیری تھی لیکن مہندر کا وجود اپنی مکمل تجش کے ساتھ روشنی بن کر میری رگوں میں اترنے لگی تھی جو

باتیں ہم اس لئے کر رہے تھے کہ مجھے اور کچھ سوچنا ہی نہیں تھا ورنہ مجھے قطعاً ایسی باتوں سے دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو چاہتا تھا کہ ہم دونوں صرف اپنے متعلق باتیں کریں۔ اپنے متعلق سوچیں اور بس۔

قریباً آدھی رات ہماری باتوں کی نذر ہو گئی۔ تب مہندر نے مجھے وقت کا احساس دلایا۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ بھی طوفا کر رہا تھا۔ الگ ہو کر وہ نہ تو اس کا جی نہیں چاہتا تھا ہمارے اختیار میں ہوتا تو دونوں اسی طرح بیٹھے بیٹھے ساری زندگی باتیں کرتے رہتے۔

"چاچا عمو! اس وقت گھر کا ایک چکر لگایا کرتا ہے۔" اس نے مجھے کہا۔ "اور مجھے نہ دیکھ کر وہ پریشان ہو جائے گا۔"

خود مجھے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ چچا جو میرے ساتھ ہی میلے میں آیا تھا مجھے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب دوبارہ ملاقات کی کیا صورت ہوگی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اپنے دوپٹے کے پلو سے اگلی مروڑتے ہوئے بولی۔

"جب مجھے یاد کروں گے۔ جہاں بلاؤ گے آ جاؤں گی۔"

میں میلے سے اس کے لئے مضامی لے کر آیا تھا۔ لیکن وہ جوں کی توں رکھی تھی۔ جاتے ہوئے مہندر وہ مضامی ساتھ لے گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ اسے مضامی بڑی چھپا کر رکھنی پڑے گی مجھے پریشانی اس بات کی تھی کہ اب میرا چچا تو اس گاؤں میں آنے سے رہا کہ میں اس کے ساتھ یہاں آ کر مہندر سے مل لیا کروں گا۔ انہی میرے پاس کوئی ایسا پیغام تھا کہ جس کے ذریعے اسے کوئی اطلاع کر سکتا۔ بہر کیف یہ مسئلہ مہندر کا نہیں میرا تھا۔

میں نے پچھلے دو دنوں میں میلے میں آ کر لوگ داستانیں گانے والوں سے ہیرا پنجا اور مرزا صاحبان سن لی تھی اور یہ جان لیا تھا کہ سچے عاشقوں کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ پھر میری مردانہ غیرت نے مجھے مجھوڑ کر کہا

میں نے پچھلے دو دنوں میں میلے میں آ کر لوگ داستانیں گانے والوں سے ہیرا پنجا اور مرزا صاحبان سن لی تھی اور یہ جان لیا تھا کہ سچے عاشقوں کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ پھر میری مردانہ غیرت نے مجھے مجھوڑ کر کہا



ہو گئے تھے اس نے آتے ہی سوال کیا۔

میں نے بہانہ بنا دیا کہ ایک تھیز دیکھنے چلا گیا تھا اور وہاں سے واپس آ کر سو گیا۔

”کمال ہے“ چچا نے کہا ”بہی تھیز تو میں نے بھی دیکھا تھا تم کہاں تھے۔“

میں نے پھر ایک بہانہ کر دیا۔ والد صاحب اور بھائی کھیتوں پر جا چکے تھے۔ چچا نے موقعہ غنیمت جانا اور مجھے اگلی واردات کے لئے تیار کرنے لگا، اس مرتبہ چچا نے مجھے جو واردات بتائی وہ مجھے کسی اور ہی شک میں ڈال گئی۔ ہم نے نزدیکی قصبے میں سرکاری خزانہ لوٹا تھا۔ اس کے لئے کچھ اور لوگ بھی ہمارے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔

ان دنوں پنجاب میں فرنگی کے خلاف بڑی زمین تحریکیں بھی سرگرم عمل تھیں۔ انگریز افسران کے قتل اور کبھی کبھی سرکاری خزانے لٹنے کے واقعات سننے کو ملتے رہتے تھے۔ جس طرح کی واردات چچا مجھے بتا رہا تھا وہ مجھے اسی سلسلے کی ایک کڑی محسوس ہوئی لیکن میں نے اشارتاً بھی اس کا ذکر چچا سے نہ کیا۔ البتہ میرا تجسس ان لوگوں کو دیکھنے کے لئے خاصا بڑھ گیا جو اس واردات میں ہمارے ساتھی بننے والے تھے۔

”بچہ! یہ بھیڑ بکریاں تو معمولی چور بھی کھول لیتے ہیں۔ جو ان آدمی بڑا ہاتھ مارتے ہیں۔ لہا ہاتھ۔ تو ٹکڑا ہو جا۔“ اس نے مجھے ہلاشیری دلائی اور میں ہنکڑا ہو گیا۔

پانچویں روز رات گئے جب میں اور چچا اپنے ڈیرے پر سو رہے تھے تین اجنبی ہم سے ملنے آ گئے۔ ایک میری عمر کا کچھ تھا اور باقی دونوں نے اپنے نام مسلمانوں والے بتائے۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ وہ کون تھے۔ چچا نے ان سے میرا تعارف کروایا اور انہیں میری بھیلی واردات بھی سنائی۔ یہ لوگ گھوڑیوں پر بیٹھ کر آئے تھے۔ انہوں نے چچا کو کچھ سمجھایا اور ہم نے اگلی شام کو آپس میں ملاقات کے لئے ایک جگہ ملے کر لی۔

روانگی سے پہلے وہ ہمیں دو ریو اور اور خاصی گولیاں دے گئے۔ ہم دونوں چچا جیٹا انہیں چھوڑنے کے لئے گاؤں

سے باہر نکلتے گئے تھے۔

”بچہ! اس کھلونے کا استعمال بھی سیکھ لے۔ ہر جگہ ڈانگ ہی کام نہیں آتی۔ یہ طرچہ بھی کبھی کبھی بہت ضروری ہو جاتا ہے۔“

واپسی پر جب ہم ڈیرے پر پہنچے تو چچا نے مجھے بتایا۔ شام ڈھلنے سے پہلے پہلے اس ”کھلونے“ سے اچھی طرح کھیل چکا تھا۔ مجھے ریو اور ہاتھ میں پکڑ کر یوں محسوس ہونے لگا جیسے سکند اعظم میرا ہی نام ہے اور یہ ساری دنیا کسی بھی لمحے میرے قدموں تلے آ کر روندی جائے گی۔

شام ڈھلے ہم دونوں چچا جیٹا گھوڑیوں پر سوار اسی سمت اڑے چلے جا رہے تھے جدھر ہمارے دوست ہمارے منتظر تھے۔ ریو اور اور گولیاں ہم نے پکڑوں کے نیچے چھپا رکھی تھیں ان دنوں زیادہ تر لوگ گھوڑیوں پر سفر کیا کرتے تھے۔ اسی لئے کسی نے ہم پر شک بھی نہ کیا۔ مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ہم نے راتوں رات کم از کم چالیس میل کا سفر تو ضرور طے کیا ہوگا۔ ہم صبح ہونے تک جس قصبے میں پہنچے وہ میرے لئے بالکل اجنبی تھا۔ قصبے کے باہری ان تینوں میں سے ایک ہمارا منتظر تھا۔

وہ ہمیں قصبے کے باہر کھیتوں کا وسیع سلسلے میں بنی ایک حویلی میں لے آیا۔ میں نے اتنا لمبا سفر گھوڑی پر پہلی مرتبہ طے کیا تھا۔ اس لمبے سفر نے مجھے تھکا دیا تھا۔ یہاں ہمارے لئے آرام دہ بستر و کابند و بست موجود تھا۔ میں تو بستر پر گر کر ہی بے سدھ ہو کر لیٹ گیا اور دنیا جہان کی کوئی خبر مجھے نہ رہی۔

صبح جب ایک شخص نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا تو دھوپ نکل آئی تھی۔ چچا کسی ”کام“ سے گیا ہوا تھا۔ مجھے بڑی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ نہا کر جب میں دوبارہ وہاں پہنچا تو میرے لئے بھارتی ناشتہ تیار تھا۔ میں نے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور جب فراغت ہوئی تو چچا بھی ”کام“ سے لوٹ آیا۔

اس کی آمد ایک اور اجنبی کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان لوگوں کے وہاں آتے ہی سب اکٹھے ہو گئے میرا چچا اور وہ اجنبی اس گاڑی کا پروگرام معلوم کرنے گئے تھے اور چچا کو وہ بطور خاص ”موقعہ دکھانے“ لے گئے تھے۔ ان کی گفتگو سے مجھے اس

بات کا تو پکا یقین ہو گیا کہ یہ لوگ کسی باقاعدہ گروہ کے ارکان ہیں اور میرے چچا کو اس گروہ میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

”بچہ! انکڑا ہو جا، آج سہ پہر کو جانا ہے۔“ اس نے اپنے معمول کے لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

”تھیک ہے چچا! میں تیار ہوں۔“ میں نے کہا۔ دو پہر کا کھانا ہم نے اکٹھے کھایا۔ کھانے کے اختتام پر چچا نے وہاں موجود تین اور آدمیوں کو اور مجھے سمجھایا کہ ہم نے کیا کیا کرنا ہے اور اچانک اگر کوئی مصیبت آجائے تو کس نے کدھر جانا ہے۔ اس کے بعد ہم سب لوگ پیدل ہی چل پڑے۔ ہماری منزل اس قصبے سے قریباً دوڑھائی میل دور ایک سڑک کا موڑ تھی۔

مقررہ وقت سے قریباً دس پندرہ منٹ پہلے ہی ہم وہاں پہنچے تھے۔ سڑک کے دور دروز کئی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں جن میں چھپے ہم اس سرکاری کار کے منتظر تھے جس میں خزانہ آ رہا تھا۔

جس جگہ ہم لوگوں نے ناکہ بندی کی تھی اس کے ساتھ ہی جو موڑ گھومتا تھا اس پر میرے چچا کے ساتھیوں نے بڑے بڑے پتھر رکھ کر اسے بند کر دیا تھا۔ شاید انہیں یقین تھا کہ اس سڑک سے اور کوئی ٹریفک نہیں گزرے گی۔

میرے لئے یہ دوسری اور انتہائی خطرناک واردات تھی۔ ہم لوگ دن دیہاڑے سرکاری خزانے پر ڈاکہ مار رہے تھے جس میں یقیناً مسلح محافظ بھی موجود ہوں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں بڑا خوفزدہ تھا۔ یہاں ان لوگوں کے سامنے بڑی دل کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

انتظار کا ایک ایک لمحہ بڑا جان لیوا اور اذیت ناک تھا۔ خدا خدا کر کے ہماری مراد برآئی جب یہاں سے ساٹھ ستر گز دور ایک درخت پر چڑھے ہمارے ایک ساتھی نے ہوا میں زور زور سے رو مال ہلا کر ہمیں اس بات کا تسکین دیا کہ کار آ رہی ہے۔

”بچہ! انکڑا ہو جائے۔“ چچا نے جو میرے ساتھ ہی موجود

## قدرت کے پجاری

سیب کے درخت کی ایک ٹہنی پھل کے بوجھ سے جھکی جاتی تھی اور جب کبھی سندھ سے اٹھتی ہوئی سرد ہوا میں تیزی آتی تو ٹہنی ہماری آنکھوں کے سامنے لچکے لچکتی اور جب بھی سیبوں سے لگی شاخ میری آنکھوں کے آگے جھکتی تو میں حیرت میں مبتلا ہوتا۔ انہیں ابھی تک کسی نے توڑا کیوں نہیں تھا۔

اگر سیبوں سے لدے یہ درخت کسی اور موٹل کسی اور ہوٹل کے لان میں ہوتے تو یقیناً ان کی جانب ہاتھ بڑھتے اور انہیں خالی کر دیتے۔ لیکن یہ درخت کے نو موٹل میں تھے۔ یہاں جو لوگ آتے تھے وہ قدرت کے پجاری آتے تھے۔ اس کے حسن کو دیکھنے والے۔ اسے شدید طور پر چاہنے والے، وہ اسے نوج نہیں سکتے تھے۔ پجاری جو تھے اور اسی لئے سیبوں سے بھری یہ ٹہنیاں محفوظ تھیں۔ پہنچ میں تھیں پھر بھی محفوظ تھیں۔

(مستضر حسین تارڑ کے سفر نامے ”کے نو کہانی“ سے)

تھامیری پیٹھ پر ہاتھ مار کر مجھے ہنسی دی۔

ہم نے اپنے ریو اور فائرنگ کے لئے بالکل تیار کر لئے اور ہوشیار ہو کر بیٹھ گئے۔ کار اب مجھے بھی نظر آنے لگی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوتی جا رہی تھیں۔ کار درمیانی رفتار سے آ رہی تھی۔ جب وہ آجائے اس موڑ پر گھومی تو ڈرائیور نے آگے رکاوٹ دیکھ کر اتنی تیزی سے بریک لگائی کہ سب حیران ہی رہ گئے۔

ڈرائیور سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ ہم نے کیا اور ہوا میں فائرنگ کرتے ہوئے کار کو گھیرے میں لے لیا۔ چچا نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر اگلا دروازہ کھولا اور اندر موجود ایک انگریز کی طرف ریو اور تان لیا۔ کار کی بھیلی سیٹ پر دو ہندوستانی کچھ سپاہی بیٹھے تھے۔ لیکن وہ اتنے بوکھلائے ہوئے تھے کہ اپنی رائفلیں ہی نہیں سنبھال سکے تھے۔ ڈرائیور ایک جاٹ تھا۔ ہم نے انہیں نیچے اتارنے کا حکم دیا۔ چاروں ہاتھ اوپر اٹھائے باہر نکل آئے۔ انگریز بڑا غصے میں دکھائی دے رہا



تھا۔ اس نے ہمیں انگریزی نما اردو میں گالیاں بکنا شروع کر دیں۔ ابھی اس کے منہ سے بمشکل دو تین گالیاں ہی نکلی تھیں جب میرے چچا اور ہمارے ساتھ موجود کچھ کے ریو لوروں نے قریباً ایک ساتھ شعلے اگلنے شروع کر دیے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ان لوگوں کے دل میں انگریز کے خلاف زبردست نفرت موجود ہے انہوں نے چار چار فار انگریز پر کیے اور وہ زمین پر گر گئے ہی تو دم توڑ گیا۔ دونوں ہندوستانی سپاہی بڑے خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔

ہم نے ان کی مشکلیں ان کی پگڑیوں سے کس کر باندھ دیں اور انہیں جھاڑیوں میں پھینک دیا۔ انگریز کی لاش بحیثیت کریم نے ان کے قریب ہی جھاڑیوں میں پھینک دی تھی۔ مجھے حیرانگی یہ ہوئی تھی کہ کسی نے ابھی تک کار کے ڈرائیور کو کچھ نہیں کہا تھا۔ پھر یہ حیرانگی بھی جلد ہی دور ہو گئی جب میں نے اسے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر پتھر پھینک دیکھا۔

یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ہمارا ساتھی ہے! تھوڑی دیر بعد ہم لوگ اسی کار میں سوار اُسے چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر جو واردات کے مقام سے قریباً دو ڈھائی میل دور تھی ہم نے کار کھڑی کر دی۔ ڈرائیور نے ایک چابی سے پچھلی ڈیگول دی جہاں تین تھیلے نوٹوں کے بھرے ہوئے تھے۔ ایک چچا نے اور باقی تین ساتھیوں نے اٹھا لئے۔ ڈرائیور کو ایک طرف لے جا کر چچا نے کچھ سمجھایا وہ سر ہلاتا رہا۔ پھر کار بھاگ کر لے گیا۔ وہ شاید کار کو ٹھکانے لگانے لے جا رہا تھا۔

ہم لوگ قریب کھیتوں کے سلسلے میں گھسے اور قریباً ایک گھنٹہ بعد اس جگہ پہنچ گئے جہاں گھوڑیاں بندھی تھیں۔ چچا نے وہ تھیلیاں کھولا اور نوٹوں کی درجنوں گڈیاں میرے اور اپنے کپڑوں میں ٹھونس کر باقی ان لوگوں کو تھما دیں۔ وہ چاروں آپس میں کچھ صلاح مشورہ کرتے رہے۔

قریباً دس پندرہ منٹ بعد ہی ہم لوگ وہاں سے الگ الگ سمتوں کو چل دیے۔ میں اور چچا شام ڈھلے گاؤں پہنچ گئے۔ یہ نوٹ ہم نے ڈیرے میں پہلے سے موجود خفیہ جگہوں

پر چھپا دیے۔

سات آٹھ روز بعد ایک رات پھر سب لوگ ڈیرے پر جمع ہوئے۔ معلوم ہوا کہ پولیس نے ارد گرد کے تمام بد معاش گرفتار کر رکھے ہیں۔ لیکن ہمارے نام کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھے۔ صبح تک وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے بالکل علم نہ ہوسکا کہ لئے ہوئے خزانے کی باقی رقم کدھر گئی ہے۔

والدین مجھ پر کیا کنٹرول کرتے اب تو وہ بیچارے خود مجھے اپنی عزت کے لئے خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ڈیرہ سال کے عرصے میں میری دھاک ہمارے ارد گرد کے سو پچاس دیہاتوں پر بیٹھ چکی تھی۔ اس دوران میں نے درجنوں پولیس ریمائڈر کاٹے تھے۔ لیکن اپنے چچا کا صحیح جانشین ہونے کا ثبوت دیا اور کبھی پولیس کو ایک پھوٹی کوڑی بھی برآمد نہ کروائی۔

اس دوران میں نے اپنی اور مہندر کی بقاعدہ ملاقاتوں اور پیغام رسانی کا ایک ذریعہ بھی تلاش کر لیا تھا اور وہ تھی حنیفاں!

حنیفاں کا سینہ حساس تعارف تو یہ ہے کہ وہ واقعی تھی اور ہمارے دس پندرہ دیہاتوں میں قریباً ہر کوئی اسے جانتا پہچانتا تھا۔ لیکن اس کی ایک خاص قابلیت کا علم عام لوگوں کو نہیں تھا۔ صرف میری دنیا کے لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ پولیس کے لئے مخبری کا کام بھی کرتی تھی اور کبھی کبھی یہ مخبری دوطرفہ ہو جایا کرتی تھی۔ وہ یوں کہ حنیفاں دونوں پارٹیوں کا وزن کرتی جس کا پلڑا ہماری ہوتا ہی طرف جھک جایا کرتی تھی۔

حنیفاں کے پاس گھروں کے اندر کی کئی کہانیاں ہوتی تھیں۔ کسی کا پیغام کسی تک پہنچانا اس کا پیشہ تھا۔ بد معاش لوگ اس سے عموماً یہ کام لیا کرتے تھے کسی بیچارے کی غریب لڑکی کو تازہ لیتے اور حنیفاں کی معرفت اسے بہلا پھسلا کر اس بد معاش تک لے آتی بعد میں جو کچھ ہوتا اس کو سب ہی بہتر سمجھتے ہیں۔

ایک روز جب میں ایک واردات سے واپس آیا تو حنیفاں مجھے راستے ہی میں مل گئی۔ اس دنیا میں تھوڑا عرصہ گزارنے کے بعد میری جھجک ختم ہو چکی تھی اور میں ہر کسی کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا۔

حنیفاں کو کچھ کر مجھے خیال آیا کہ آخر کب تک یوں رات کے اندھیرے میں مہندر کے گھر جاتا رہوں گا۔ اس دوران اشیر سنگھ کے آدمی یہ جان چکے تھے کہ میں بے گناہ نہ صرف جیتا ہوں بلکہ اب اس کا ایک بازو بھی بن چکا ہوں۔ ہماری آپس میں دشمنی تھی۔ اگر کسی کو یہ شک بھی ہو جاتا کہ میں مہندر سے ملتا ہوں تو وہ میری جان لئے بغیر نہ ملتے یہ بھی ممکن تھا کہ میرے بجائے مہندر بھی ان کا نشانہ بن جاتی تھی۔ صرف یہ علم ہونے پر وہ مہندر کے ذریعے مجھے یہاں بلا کر اپنے جال میں پھانس سکتے ہیں۔ وہ مہندر کی جان کو آجاتے اور میں جانتا تھا کہ مہندر مر جاتی لیکن کبھی ان کی بات نہ مانتی اور مجھے دھوکے سے بلانے پر رضامند نہ ہوتی۔

انکار کی صورت میں اسے جس انجام سے دوچار ہونا پڑتا اس کا تصور ہی میرے لئے بڑا اندھن کا تھا۔

میں کچھ سوچ کر میں نے حنیفاں کو آج پہلی مرتبہ مخاطب کیا۔ میں ایسی گھٹیاں عورتوں کو تو مت لگا نا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ اس سے پہلے خود حنیفاں کئی دفعہ مجھے کہہ چکی تھی کہ اس کے لائق کوئی خدمت نہ ہوتا تو اس میں اس "خدمت" کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اور حنیفاں بھی یہ جانتی تھی کہ اس کے لئے مجھے اپنا احسان مند بنانا ضروری ہے۔

"مائی حنیفاں" میں نے اسے آواز دی۔

"جی سرکار" اس کی پانچویں تو آواز پر کھل گئیں کہ میں نے آج پہلے اسے مخاطب کیا ہے۔

"شام کو ڈیرے پر آنا۔"

"آؤں گی مائی باپ ضرور آؤں گی۔ اکیلی آؤں یا۔۔۔۔۔"

اس نے بڑے ہودہ سا اشارہ کر کے بات نامکمل چھوڑ دی۔

"اکیلی آنا۔ اور یاد دہاتیں کرنے کی بھی ضرورت نہیں"

میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ شام کو میں ڈیرے پر آ گیا ہی تھا۔ چچا کل سے ایک مہم پر نکلا ہوا تھا۔ وہ شام ڈھلنے ہی آگئی میں نے بغیر کوئی گئی لپٹی رکھے اسے بتا دیا کہ میرا مدعا کیا ہے۔

"واہ چوہدری جی کیا گھینڈ تلاش کیا ہے۔" وہ اپنی عادت

کے مطابق بات کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"حنیفاں اس بات کا خیال رہے کہ آج کے بعد کبھی میرے سامنے کوئی گندی بات مہندر کے متعلق زبان پر نہ لانا اور ہاں یہ بھی سن لو اگر یہ بات تمہارے علاوہ کسی دوسرے تک پہنچ گئی تو تم۔۔۔ میں نے بات نامکمل چھوڑ دی تھی لیکن مائی حنیفاں سمجھ چکی تھی کہ میں کیا کہنے والا ہوں۔

اسے حیرانگی تو ضرور ہو رہی ہوگی کہ مجھ جیسا انسان کسی لڑکی سے پاکیزہ محبت بھی کر سکتا ہے اور لڑکی بھی اچھوت قوم کی ہندو لڑکی ہے۔

"تم نے صرف میرا پیغام کبھی بھی لے کر جانا ہے اور بس اس کے علاوہ اس سے کبھی ملنے کی بھی کوشش نہ کرنا۔ حنیفاں مائی ہم کسی کا حق نہیں مارتے تمہیں تمہاری خدمت کا انعام ضرور دوں گا لیکن یہ بات یاد رکھنا کبھی مہندر کو کریدنا نہیں۔"

مائی حنیفاں بڑی مکار عورت تھی۔ میرا موڈ دیکھ کر وقتی طور پر چپ ہو رہی میں نے اپنی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑا انعام تھا۔ حنیفاں نے پہلے تو نہ نہ کی پھر نوٹ چلایا۔

میں جس زندگی میں قدم رکھ چکا تھا اس میں کسی بھی لمبے موت میرا گھل دو بچ سکتی تھی۔ والد نے مجھ سے ایک طرح غلط توڑ لیا تھا اور ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر میں مہندر سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ ملک کے سیاسی حالات روز بروز بدل رہے تھے۔ بھلے میں چور ڈاکو بن چکا تھا۔ لیکن مسلم لیگ کی سیاست سے میں بھی اپنے دیہات کے دوسرے لوگوں کی طرح متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

میرے والد صاحب اپنے گاؤں میں مسلم لیگ کے سالار تھے اور ہم نے سکھوں کی دشمنی مول لے کر بھی ایک بڑا جلسہ اس علاقے میں مسلم کارواں دیا تھا۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ میں الجھ کر رہ گیا جبکہ دوسری طرف مہندر پچھلی دو تین ملاقاتوں سے کچھ بدلی بدلی دکھائی دینے لگی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس میں وہ پہلے والی دیر کی نہیں رہی۔

جوں جوں اس کی محبت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ



بزدل فتنی جاری تھی۔ پہلی بار جب وہ حقیقات کے پیغام پہنچانے پر مجھ سے ملنے آئی تو اس نے بڑی عجیب سی خواہش کا اظہار کر دیا۔

”چوہدری مجھے آج ہی مسلمان ہونا ہے۔“ میں بھونپکا رہ گیا۔

میں محسوس ہی نہ کر سکا کہ جس روز سے میری اور مہندر کی ملاقات ہوئی تھی اس نے اپنے ہمسائے میں واقع مسلمان مولوی کے گھر آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ ان مولوی صاحب کا ذکر وہ اکثر مجھ سے کیا کرتی تھی۔ لیکن مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ اسلام کی حقانیت سے اتنی جلدی متاثر ہو جائے گی۔ پچھلی دو ملاقاتوں سے اس نے یہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب جیسے بھی ممکن ہو میں اسے یہاں سے نکال کر لے جاؤں۔

میں حیرت سے اس کا منہ جھانکنے لگا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں قلم کر بڑے جتنی لہجے میں کہا۔ ”چوہدری میں نے تمہیں نہیں بتایا میرا باپ میری شادی کہیں طے کر رہا ہے میں اسلام دھرم کو دل سے قبول کر چکی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے موت بھی آئے تو مسلمان ہو کر مروں۔“

مہندر کی اس بات نے مجھے خاصا جذباتی کر دیا۔ لیکن سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کی یہ خواہش کیسے پوری کروں۔ اس نے غالباً میری دلی کیفیت کا اندازہ کر لیا تھا۔ مجھے چپ دیکھ کر بولی۔ ”چوہدری! میں نے مولوی صاحب سے بھی کہا تھا۔ لیکن وہ ذلیلداروں کے خوف سے مجھے کلمہ نہیں پڑھا سکے اب تم بھی۔“

”مہندر! خدا کے لئے۔ ایک لفظ بھی آگے نہ بولنا۔“ میں نے اسے کہا۔

میں اب مہندر سے ملنے کے لئے گھوڑی پر بیٹھ کر جایا کرتا تھا اور یوں بھی اب میرے لئے ہر طرف خطرات تھے۔ میں مہندر کا بازو پکڑا اور اسے گھوڑی پر سوار کر دیا۔ خود میں اس کے پیچھے بیٹھا اور گھوڑی کو اڑنے لگا دی۔ میرے ذہن میں ابھی کچھ واضح نہیں ہوا تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ ہمارے نزدیک

میں سوائے خدا کی ذات کے اور کسی سے ڈرنے والا نہیں۔ مجھے کوئی دھونس دھمکی نہ دینا۔ میں کسی کو زبردستی کلمہ پڑھا کر اپنے خدا کے سامنے ظالم اور گناہگار نہیں ٹھہرنا چاہتا۔“

میں ان کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ یہ کوئی آج کل کے مولوی نہیں تھے۔ بڑے دہنگ اور اللہ والے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کے سامنے گردن جھکا تو نہ سیکھائی نہیں تھا انہوں نے جج کہا تھا واقعی وہ کسی غنڈے بد معاش سے ڈرنے والے نہیں تھے۔

میں باہر نکل آیا، قریباً چندہ میں منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد بالآخر انہوں نے دروازہ مجھ پر کھولا۔ وہاں مہندر موجود نہیں تھی۔

”میں مطمئن ہو۔ وہ میری بیوی کے پاس ہے۔ میری بیوی اسے غسل اور وضو کروا کر لائے گی۔“ انہوں نے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وضاحت کر دی۔

مزید پانچ چھ منٹ گزر گئے۔ سامنے والے دروازے سے ایک بوڑھی عورت مہندر کا بازو تھامے اندر داخل ہوئی۔ یہ مولوی صاحب کی بیوی تھی۔ اس نے مہندر کو ہمارے سامنے والی چار پائی پر بٹھادیا اور خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔

”بہنی! ایک مرتبہ پھر سوچ لو۔ تم پر جبر نہیں ہے۔ ہمارے دین میں کسی پر جبر نہیں کیا جاتا۔“ مولوی صاحب نے اسے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

”مولوی صاحب! میں نے سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔ خدا کے لئے میرے صبر کو نہ آزمائیے۔“ مہندر کی آواز میں جانے کیا سوز تھا کہ میں تڑپ کر رہ گیا۔

اس کے باوجود مولوی صاحب اور ان کی بیوی نے بار بار مہندر سے اقرار کر دیا کہ وہ دل سے اپنی مرضی سے کسی کے جبر کے بغیر یہ فیصلہ کر رہی ہے۔ جب انہوں نے ”الحمد للہ“ کہا اور قرآن پاک کچھ آیات پڑھ کر ان کا ترجمہ مہندر کو سمجھایا۔

ان آیات میں اسلام کے بنیادی اصول بتائے گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے مزید پانچ سات منٹ مہندر کو اسلام کی حقانیت اور قرآن میں سمجھانے پر لگائے اور آخری مرتبہ پھر اس کی

رضا مندی طلب کرنے کے بعد اسے کلمہ پڑھا کر مسلمان کر دیا۔

میرے علاوہ شاید مولوی صاحب بھی حیران ہی رہ گئے کہ اس نے کلمہ پہلے سے یاد کر رکھا تھا۔ پھر وہ دوسرا اور تیسرا کلمہ بھی خود ہی پڑھ گئی۔ یہ اس کی اسلام سے محبت کی انتہا تھی۔ اس نے مولوی صاحب کو بتایا کہ اس نے عربی کا ابتدائی کاغذہ بھی پڑھ لیا ہے۔ مولوی صاحب نے اس کا اسلامی نام مریم بی بی رکھا اور زمیں جانے کی اجازت دے دی۔

شاید آپ لوگوں کو اس بات کا یقین نہ آئے کہ جب مہندر مریم بننے کے بعد باہر آئی تو میں نے اس کے چہرے سے نور کی شعاعیں پھوٹی محسوس کی تھیں۔ بخدا ایسا پر نور چہرہ میں نے زندگی میں اس کے بعد پھر کبھی نہ دیکھا۔ اس لئے میرا دل اور اس کی عقیدت سے بھر چکا تھا۔ مجھے وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق نظر آ رہی تھی۔ اس مرتبہ وہ میرے پیچھے بیٹھی۔ ہم نے تمام راستے کوئی بات نہ کی اور میں اسے اس کے گاؤں تک لے آیا۔

مریم نے گھوڑی سے اتر کر کہا۔ ”چوہدری! اب میں وہ ہندو لڑکی نہیں رہی۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو خدا کے لئے تم بھی دل سے مسلمان ہو جاؤ۔ یہ زندگی چھوڑ دو اور مجھے نکاح کر کے لے جاؤ۔ بخدا میں تمہارے ساتھ بھوکا رہ کر بھی تمام زندگی تمہاری خدمت میں گزار دوں گی۔ اب میرے باپ کا گھر میرے لئے جہنم بنا رہا ہے گا۔ وہاں بد معاش لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے اور میں۔۔۔ وہ خاموش ہو گئی۔

اس کی نظریں جھک گئیں۔ مجھے تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا پھر اس نے نظریں اٹھائیں اور میری آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ ”تم نے میرا ہاتھ ہمیشہ اپنانے کے لئے پکڑا تھا۔ اگر مرد کے بچے ہوتے تو یہ بات بھی نہ بھولنا۔ اگلی مرتبہ جب آؤ گے تو مجھے ہمیشہ لے جانے کے لئے آنا۔ اچھا خدا حافظ۔“

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف چل دی اور میں بہت سادہ سمجھت اور وفا کی اس عظیم دیوی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بخدا اس لئے میں اپنے دل میں اس کے



لئے جو جذبات محسوس کر رہا تھا آج بھی ان کا تصور میرے  
مردہ تن میں زندگی کی لہر دوڑا دیتا ہے۔

رات قریباً آدھی بیت چلی تھی۔ میں نے نور کے اس  
ہائے کو دور تک جاتے ہوئے دیکھا جب وہ اندر سے کی چادر  
میں گم ہو گئی تو میں بوجھل قدموں سے واپس لوٹا اور اپنی کھوڑی  
پر بیٹھ کر اسے ایز لگا دی۔

اس روز واقعی یہ عزم کر کے لوٹا تھا کہ اگر والدین مریم  
سے شادی کے لئے نہ مانے تو میں اسے بیاہ کر سکی اور طرف  
نکل جاؤں گا۔ جلد یا بدیر آخر وہ میرے ماں باپ تھے مان ہی  
جاتے۔ مجھے علم تھا کہ چچا آج کل ایک لمبا ہاتھ مارنے کے  
چکر میں ہے اور یہ کام بھی انہی لوگوں کے اشارے پر ہم کر  
رہے تھے جن کا عہد میں اپنی لاکھ کوشش کے باوجود نہیں پاسکا  
تھا۔

یہ لوگ بالکل اچانک چچا سے رابطہ قائم کرتے تھے۔ ان  
کی آمد میرے لئے اس بات کا اشارہ ہوتی تھی کہ میں یہاں  
سے اٹھ کر چلا جاؤں۔ ایک دوسرے میں سے بچا کو کریدنے کی  
کوشش بھی کی لیکن اس نے میرے لاکھ بھند ہونے کے  
باوجود مجھے مال دیا۔

”بچو! ابھی حیرے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں تو ان چکروں  
میں نہ پڑا کر۔“ وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیا کرتا۔

اس روز جب میں مریم سے مل کر وہاں ڈیرے میں پہنچا  
تو چچا کو اچانک اپنا منتظر پایا۔ چچا پچھلے دو دنوں سے غائب تھا  
اور آج اچانک واپس آ گیا تھا۔ حالانکہ اس نے ایک روز بعد  
واپس آنا تھا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ وہ یہاں ہے تو میں کبھی یہاں  
نہ آتا۔

”بچو! واردات تو تم کر کے آئیں رہے، چکر کوئی اور  
ہے۔ چچا بچاؤ اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہو۔“ چچا  
نے بغیر کوئی گلی لپٹی رکھے مجھے سیدھا سوال پوچھ لیا۔ ”دیکھو  
مجھے اس بات کا یقین ہے کہ تم اپنے باپ کے ساتھ تو جھوٹ  
بول سکتے ہو، میرے ساتھ نہیں بولو گے۔ اس لئے تم جو بھی کہو  
گے میں یقین کر لوں گا۔ میرے اہم دو گھنٹے نہ پہنچایا۔ بعد میں

یعنی ان میں سے ایک ہندو تھا اور دوسرا مسلمان۔ حالانکہ  
میرے اندازے کے مطابق وہ دونوں مونے سکھ تھے۔

ہم چاروں ٹرین کے ذریعے دوسرے ضلع میں شام گئے  
پہنچے جگے تھے۔ اگلی رات کو یہ واردات ہوئی تھی۔ ان لوگوں  
نے اس بات کا بندوبست کر لیا تھا کہ جو ٹرین ہمارا نشانہ بننے  
والی تھی۔ اسے راستے میں ایک مطلوبہ مقام پر سٹپل ڈاؤن کر  
کے روکنا ہے۔ اس سٹپل کا کاٹنا بدلنے والا بھی ان کا اپنا آدمی  
تھا۔

ہم اگلے روز شام سات بجے تک دو دو کی ٹولیوں میں  
مطلوبہ مقام پر پہنچے جگے تھے۔ ہم دونوں کے علاوہ وہاں چھ  
ساتھی اور موجود تھے۔ لیکن یہ سب میرے لئے انتہی تھے۔ وہ  
دو لوں خان اور شرممان میں شامل نہیں تھے۔

ریلوے اسٹیشن سے قریباً ڈیڑھ دو فرلانگ دور ایک جگہ وہ  
کار ہمارے ساتھیوں نے چھپا رکھی تھی۔ جس میں پتھر ہمیں  
ایک خاص مقام تک جانا تھا۔ اس کے بعد یہ کار بھی چھوڑ دینی  
تھی۔ اس زمانے میں اکا دکا لوگ ہی کار رکھ سکتے تھے۔ میرا  
دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ کار بھی چوری کی ہوگی۔

ہمیں فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق یہ چار پانچ ڈیوں  
پر مشتمل ٹرین تھی اور سرکاری خزانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اس  
پر منتقل کیا جا رہا تھا۔ مجھے بتایا تو نہیں گیا تھا لیکن اس بات کے  
قوی امکانات موجود تھے کہ اس ٹرین میں ان لوگوں کا کوئی  
آدمی بھی موجود ہو۔

خدا خدا کر کے آٹھ بجے ہمیں سٹپل ملا کہ ٹرین وقت  
مقررہ پر آ رہی ہے۔ پھر ٹرین نظر آ گئی۔ میں اور چچا اکٹھے ہی  
بیٹھے تھے۔ چچا نے میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر حسب عادت  
مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ جواب میں میں نے  
آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے یقین دلایا کہ میں تیار ہوں۔

ٹرین منصوبے کے مطابق روک لی گئی۔ ہم لوگوں نے  
گھیرا بھی ڈال لیا۔ لیکن خلاف توقع ٹرین کے دو ڈبے فوجیوں  
سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ بات ہمارے علم میں نہیں تھی کہ  
میں وقت پر ان لوگوں کو ہمارے منصوبے کا علم ہو گیا تھا اور

انہوں نے ہمیں دھوکے میں رکھ کر مارنا چاہا تھا۔

یہ سب تربیت یافتہ فوجی تھے۔ ہم نے ان پر فائرنگ  
شروع کر دی اور چپا کہ اس فائرنگ کی آڑ میں نکل جائیں  
لیکن انہوں نے ہماری کوشش کا کام بنادی۔ وہ ہماری فائرنگ  
کے دوران ہی بڑی تیزی سے ہمارے گرد گھیرا ڈال سکے  
تھے۔ پندرہ بیس منٹ کے معرکے میں ہمارے تین ساتھی  
مارے گئے۔ میرے چچا کے بازو میں گولی لگی تھی۔ میں نے  
بھاگنے کی کوشش کی لیکن قسمت اچھی تھی کہ گرفتار ہو گیا۔ ہمارا  
ایک ساتھی بچ کر نکل گیا تھا بعد میں وہ بھی پکڑا گیا۔

وہ لوگ چچا کو ہسپتال لے گئے اور مجھے ی آئی ڈی کے  
ایک تفتیشی مرکز میں لے آئے۔ اس سے پہلے میں درجنوں  
بار تھا توں میں آ جا چکا تھا۔ لیکن سٹاف میں جانے کا یہ پہلا  
اتفاق تھا۔ مجھے چچا نے ایک بات بتائی تھی کہ ”بچے تھانے میں  
کبھی ”ہاں“ نہ کرنا اور ڈیل میں کبھی ”ناں“ نہ کرنا۔“

میں اس دنیا کے اسرار و رموز مجھے لگا تھا اور جانتا تھا کہ  
اگر میری زبان سے یہ بات نکل گئی کہ میرا تعلق کسی زیر زمین  
تحریک کے ساتھ ہے تو یہ لوگ مجھے جیتے جی مار ڈالیں گے۔  
اگر زندہ بچ کر جیل پہنچ ہی گیا تو بھی اول یہ لوگ کسی انگریز کا  
مدعا مجھ پر ڈال کر پھانسی پر لٹکا دیں گے نہیں 20 سال تو بچی  
سزا ہے۔!

تین مہینے تک وہ لوگ میرے ریمانڈ لیٹرے رہے۔ وہ مجھ  
سے یہی بات منواتا چاہتے تھے کہ میرا تعلق کسی زیر زمین تحریک  
کے ساتھ ہے۔ لیکن میرا ایک ہی بیان رہا کہ میں تو معمولی سا  
چور اچکا ہوں۔ زیادہ دولت کے لالچ میں آ گیا تھا۔ مجھے علم  
نہیں کہ میرے ساتھ لوگ کون تھے۔

تین ماہ بعد جوڈیشل ریمانڈ پر خلیل بھیج دیا گیا۔ یہاں  
میری ملاقات تین ماہ بعد چچا سے ہوئی وہ بھی میرے جتنا  
ریمانڈ ہی کاٹ چکا تھا۔ اس دوران ہماری کوئی ملاقات نہیں  
ہو سکی تھی حالانکہ جس سٹاف میں میں ریمانڈ کاٹ رہا تھا وہیں  
میرا چچا بھی موجود تھا۔

ان تین مہینوں میں اگر کسی چیز نے مجھے ستایا تھا تو وہ تھی



مریم کی یاد! جب کبھی رات کو میں زخموں سے بے حال اپنے بیل میں لیٹا نیند کی گود میں ساتا تو بے اختیار مریم میرے خوابوں میں چلی آ جاتی۔ میں یہ سوچ کر ٹوٹ جاتا کہ آخر وہ کیا سوچتی ہو گی؟ میری ایسی مسلسل غیر حاضری اور وہ بھی اس کے اسلام قبول کرنے کے بعد۔ وہ میرے متعلق خدائے تعالیٰ کوئی لفظ اندازہ قائم نہ کر لے۔

اس زمانے کی جیلیں سخت ہوتی تھیں اور عموماً امیر غریب کے لئے ایک سی ہی ہوتی تھیں۔ آج کی جیلوں کی طرح نہیں کہ جو غریب مظلوموں کے لئے جہنم اور امیروں کے لئے جہنم ہے۔ کیا خیال جو چڑیا بھی اندر پر مار سہ ہر سہ۔ سو کو تین ماہ تک ہماری ہوانہ گھنے دی گئی اس کے بعد وہ لوگ بیل میں ہماری ملاقات کو آ گئے۔

میرے بچا کا بیان بھی مجھ سے مختلف نہیں تھا۔ کیس چلے لگا۔ اس دوران میں اور بچا ایک ہی حوالا میں بند رہے۔ جب کبھی میں اچانک کہیں کھو جاتا تو بچا میرا دکھ جان لیتا۔ میں نے محسوس کیا وہ مجھ سے بھی زیادہ دکھی ہو جاتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھے اس طرح خیالوں میں گم دیکھ کر کہا۔

بچو! کاش میں اس واردات پر تمہیں ساتھ نہ لے جاتا۔ مجھے کبھی کسی بات نے اتنا پریشان نہیں کیا جتنا تمہارا دکھ نے کیا ہے۔

سال ڈیڑھ سال ہم تاریخیں بھٹکتے رہے۔ اس دوران بمشکل دوسرے بچے کسی ذریعے سے میرا پیغام مریم تک پہنچایا۔ اس نے جواب میں مجھے کہلا بھیجا تھا کہ وہ میری ہے اور میری ہی رہے گی۔ اس نے کہا تھا کہ زندگی کے آخری سانس تک میرا انتظار کرے گی۔ پھر مجھے کوئی بھی ایسا پیغام میرس نہ آ سکا جس کے ذریعے میں مریم کو اپنا پیغام بھیج سکتا۔ سرکار نے ہم پر تین چار ٹکڑے ڈال دیئے تھے اس دوران 1946ء آ گیا۔

1946ء کے قریباً تیسرے یا چوتھے مہینے ہمیں عمر قید کی سزا ملی آزادی کے دن نزدیک آنے کی وجہ سے ان دنوں قیدیوں کو کالے پانی نہیں بھیجتے تھے۔

”چوہدری تو بھی کیا یاد کرے گا کسی سکھ سے یاری تھی۔“ لال تھا۔

اس نے تھوڑی دیر بعد سر اٹھا کر کہا ”میرا انتظار کر۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

مجھے اقبال سنگھ پر اچھا دھکا کہ وہ مجھے جھوٹا نہیں دے گا۔ وہ چلی سکھ نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ گھوڑی کے علاوہ میرے لئے کپڑے اور روٹی بھی لے آیا۔ اس نے بعد ہو کر مجھے دو چار تھپے زہر مار کر دئے اور آدھی رات کو اپنے گاؤں سے نکل آیا۔ میں نے اپنے سر پر سکھوں کی طرح پٹری باندھ رکھی تھی۔ میری ڈانگی کے بال بڑھے ہوئے تھے اور اقبال سنگھ کی کرپان میرے پاس تھی۔ کوئی بھی مجھ پر مسلمان ہونے کا شک نہیں کر سکتا تھا۔

دم رخصت اقبال سنگھ میرے گلے لگ کر رو پڑا۔ ہم دونوں پیدل ہی گاؤں کے بار تک آئے۔ ”چوہدری تجھے تیرے خدا کی قسم واپس ادھر نہ آئے۔ یہ گھوڑی لے کر پاکستان چلا جا۔“ اس نے آخری مرتبہ مجھ سے رو ہنسی آواز میں کہا۔ ”اقبال یہاں زندگی بھر تیرا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔ اللہ بخنی۔“ کہہ کر میں نے گھوڑی کو اڑی لگا دی۔ چوٹی لال کے گاؤں تک پہنچا تو صبح کاذب کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔

اس گاؤں کے بٹے ہوئے مسلمانوں کے مکانات مجھے دور ہی سے یہاں کے حالات سمجھا رہے تھے۔ لیکن مجھے مریم کے علاوہ کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ میں نے گھوڑی چوٹی لال کے گھر کے باہر روکی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو گیا پھر دروازہ کھول کر میں نے گھوڑی کو اندر کر لی اور کڑی لگا دی۔ اس دروازے نے مجھے کئی بھولی ہوئی کہانیاں یاد دلادی تھیں۔

سانسے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ کرپان میں نے ایک ہاتھ میں مضبوطی سے تمام رکھی تھی۔ اندر لائین مل رہی تھی۔ ایک چار پائی پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا ہوا تھا میں نے چادر اٹھا کر پرے پھینک دی تو وہ شخص بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں اسے بمشکل پہچان سکا وہ چوٹی



ساتھ بھاگ گئی۔ ہر اوم، ہرے اوم۔ اس نے اپنے کانوں کو چھوڑا اور آگے بڑھ گیا۔ شاید مندر جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے پوری طاقت سے میرے دل پر گھونسا مارا ہو۔ یہاں ہر لمحے مجھے جان سے جانے کا خطرہ تھا۔ کسی کو بھی میرے سکھ ہونے پر شک گزر سکتا تھا۔ خصوصاً ذلیلداروں کا تو بچہ بچہ میرے خون کا پیا سا تھا۔ پھر وہ لوگ ایسا سنہری موقع کیوں ضائع جانے دیتے۔

اگر اقبال سکھ کی گھوڑی میرے پاس نہ ہوتی تو خدا ہی جانتا ہے میں پاکستان پہنچ بھی سکتا یا نہیں، میں دیوانہ وار کھیتوں کے پتھوں سے گھوڑی بھاگتا رہا۔ راستے میں کسی نے میرا حلیہ دیکھ کر مجھ سے باز پرس نہ کی۔ میری بھوک پیاس تو جیسے مچ چکی تھی۔ گرنا پڑنا شام گئے تک میں سڑ سے چار پانچ میل دوڑتک پہنچ چکا تھا۔ اس دوران راستے میں دو تین جگہ رک کر میں نے صرف پانی پیا اور کچھ نہیں کھایا۔

یہاں پہنچ کر میں نے گھڑی وغیرہ اتار دی اور اپنی اصلیت پر لوٹ آیا۔ رات ڈھل رہی تھی جب میں نے سرحد پار کی۔ سرحد کے پار رضا کاروں نے کمپ قائم کر رکھا تھا۔ ان لوگوں نے مجھے ستم رسیدہ سمجھ کر میری ہر مگر دبو کی کی۔ یہاں سے مجھے یہ بھی علم ہو گیا کہ ہمارے دیہاتوں کے لوگ کس کمپ میں ہو سکتے ہیں۔ اقبال سکھ کی گھوڑی سے علیحدہ ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے بادل غواستہ یہ گھوڑی سرحدی علاقے کے ایک زمیندار کے پاس اونے پونے داموں فروخت کر دی۔

میں بڑا بد دل اور مایوس ہو کر والدین اور عزیز و اقارب کو ڈھونڈنے ایک کمپ کی طرف چلا گیا۔ کمپ کیا تھا؟ انسانی تاج و بر بادی کا منہ بولتا ثبوت۔ مجھے یہاں کچھ شناسا چہرے بھی دکھائی دیے۔ لیکن میرے والدین ان میں شامل نہ تھے۔ یہاں سے دوسرے کمپ کی طرف چل دیا۔ کمپ کے باہر ایک کونے میں مجھے ایک عورت سر جھکائے اپنی طرف پیٹھ کیے بیٹھی دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی میرے خون میں جیسے یک لخت بجلی سی دوڑ گئی۔ میں دیوانہ وار اس کی طرف بڑھا۔

یہ لوگ دوسرے ضلع میں جا کر رہنے لگے۔ تقسیم کے وقت جب ان کے قافلے پر حملہ ہوا تو جس کا جدر منہ اٹھا وہ بھاگ گیا۔ مریم بھی افراتفری میں کسی اور طرف نکل گئی۔ وہ بے چاری دو روز تک بھوک پیاسی ایک کھیت میں چھپی رہی۔ اس امید پر کہ شاید اس کا خاوند وہاں آ جائے لیکن اس کا خاوند نہ آیا۔

مریم پڑتی وہ پاکستان پہنچ گئی اور اب یہاں کیپوں میں اپنے خاوند کو تلاش کرتی پھر رہی تھی۔

مجھے امید تھی کہ اب مریم مجھ سے یہی کہے گی کہ جگو چونکہ مرچکا ہے اس لئے وہ میرے ساتھ شادی کے لئے تیار ہے۔ لیکن اس نے کہا ”چوہدری عورت زندگی میں ایک ہی مرتبہ شادی کرتی ہے میرا دل گواہی دیتا ہے چوہدری کہ میرا خاوند مرا نہیں۔ خدا خواست اگر ایسا ہوا بھی تو باقی زندگی اس کی یاد میں گزاردوں گی۔“

مریم کی اس بات نے میرے دل میں اس کی عقیدت کئی گنا بڑھا دی تھی۔ یہ ہندو لڑکی اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی اتنی عقیم تھی۔ میں نے مریم کی اس بات سے آگے اس سے کوئی بات نہ کی۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ اس نے اپنے دل سے میری محبت نہیں نکالی۔ جس طرح میں اسے بھول نہیں سکا تھا اس نے بھی مجھے بھلایا نہیں تھا۔

میں اس وفا اور عقیدت کے سامنے سے اٹھ کر آ گیا۔ ایک اور کمپ سے ہالہ خراپے گھر والوں کا سراغ بھی مل گیا۔ وہ لوگ ایک گاؤں میں بس گئے تھے۔ میں اپنے والدین سے ملا تو جیسے پچھلے تمام زخم ہرے ہو گئے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

میری زندگی میں اب کوئی مقصد، کوئی لگن رہی نہیں گئی تھی۔ ڈیڑھ دو سال میں نے اس گاؤں میں اپنے گھر والوں کے ساتھ گزار دیے۔ اس دوران مجھے اپنے پرانے ساتھی بھی آہستہ آہستہ ملنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے مجھے اپنے ڈھب پر لگایا۔ میری زندگی میں اب سوائے جرائم کے اور رہی کیا گیا تھا۔



دے دی۔ عدالت نے مجھے دو سال قید بامشقت کا حکم دیا۔ اس قید کے دوران مریم اور جگو کئی مرتبہ میری ملاقات کو آئے میں ان سے درخواست کی تھی کہ میری اطلاع کسی کو نہ دیں، انہوں نے میری بات بادل خواستہ مان لی۔

اس دوران مریم مجھے یہی سمجھاتی رہی کہ میں اس زندگی کو چھوڑ دوں اور اپنا گھر بسالوں۔

میں نے مریم سے کہا کہ میں اس کی دو باتیں نہیں مان سکتا۔ جیل سے رہائی پر میں نے وہ زندگی تو چھوڑ دی لیکن گھر نہیں بسایا۔ میں وہ صوبہ ہی چھوڑ گیا جہاں والدین اور مریم وغیرہ رہتے تھے۔

وقت گزرتے پتہ نہیں چلتا۔ میں اپنے گھر صرف والدین کی وفات پر گیا۔ بہن بھائیوں کو میں نے کیا سکھ دیا تھا کہ مجھے یاد رکھتے۔ انہوں نے مجھ سے منہ موڑ لیا۔ میں بھی پھر ان سے نہیں ملا۔

اس طرح کوئی کسی کی یاد میں زندگی نہیں تاج دیا کرتا۔ لیکن مجھے مریم سے جو بے نامی عقیدت ہو گئی تھی اس نے پھر میرا گھر نہ بنے دیا۔ اللہ نے مجھے سب کچھ دیا۔ آج بھی دولت مند لوگوں میں شمار ہوتا ہوں۔ یہ کہانی آپ کو کبھی نہ سناتا لیکن پچھلے مہینے مریم کا انتقال ہو گیا۔ جگو تین چار سال پہلے ہی ایک بیماری سے مر گیا تھا۔

میں اس کا افسوس کرنے بھی گیا تھا۔ تب میں نے عظمت و وفا کی اس دیوی کو شاید آٹھ دس سال بعد دیکھا تھا۔ اس کے دل میں یقیناً یہ خواہش جاگ رہی تھی کہ آج جب وہ اکیلی رہ گئی ہے کوئی اسے سہارا دے۔ یہ ٹھیک ہے جگو کے تین جوان بیٹے تھے۔ مگر اس کا کوئی رشتہ دار فساد میں زندہ نہیں بچا تھا اور مریم کا تو کوئی تھا ہی نہیں۔

لیکن..... میں مریم سے مرتے دم تک دوبارہ نہ ملا۔ مبادا کہیں عقیدت کے اس رشتے پر جو میرے اور اس کے درمیان استوار تھا بال برابر میل بھی نہ آ جائے۔

مریم کی موت کے بعد میں اس کے بچوں سے ملتا ہوں۔ وہ مجھے چچا کہتے ہیں اور میری بہت عزت کرتے ہیں۔

نمبردار اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ دوسری چارپائی پر ایک عورت اور بچہ سو رہے تھے میں نے اپنا منہ سر کیڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔ صرف آنکھیں ہی دکھائی دے سکتی تھیں۔ میں نے نفرت اور غصہ سے کھولتے ہوئے اس کی چارپائی کو ٹھوکر ماری تو نہ صرف وہ بلکہ اس کی بیوی بھی ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے۔

ان لوگوں کی شکل پر نظر پڑتے ہی میرے تو ہاتھ سے پستول گرتے گرتے رہ گیا۔ یہ جگو اور مریم تھے۔ ان کا بچہ اس سارے ہنگامے سے بے خبر بیٹھی نیند سو رہا تھا۔

”کو کو کون ہو تم..... کیا چاہتے ہو“ جگو نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ اس دوران مریم اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ غالباً اس نے میرے ہاتھ میں پکڑے پستول پر نظر رکھی تھی۔ وہ شاید اس ارادے سے آگے آئی تھی کہ اگر گولی چلا دوں تو اس کے خاوند کے بجائے اسے لگے۔

”خدا کے لئے تم جو چاہتے ہو لوٹ کر لے جاؤ، لیکن میرے خاوند کو کچھ نہ کہو۔“

مریم کے لہجے میں التجا سے زیادہ دھمکی کا تاثر نمایاں تھا۔ خدا جانے میرے بائیں ہاتھ میں کیسے حرکت پیدا ہوئی اور میں نے منہ سے نقاب ہٹا دیا۔ میری شکل پر نظر پڑتے ہی دونوں چونک پڑے۔

”تم.....“ دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ ”ہاں جگو! مجھے علم نہیں تھا کہ ملک شریف تم ہی ہو۔ وہ جو مال تم نے پکڑا دیا میرا تھا میں.....“ اس سے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا اور واپس جانے کے لئے مڑ گیا۔

”چوہدری!“ مجھے مریم کی آواز سنائی دی۔ ”کم از کم آج کی رات تو ہمارے مہمان رہو۔“

میں مریم کی آواز پر رک ضرور تھا لیکن مڑ کر اس کی طرف دیکھا نہیں۔ مجھ میں اب اس کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی باقی نہیں رہی تھی وہ میرے قدم تو ہرگز نہیں تھے۔ جن پر چل کر میں باہر آیا تھا۔

یہی کہانی..... اس کے بعد کیا ہوا۔ میں نے گرفتاری